Majallah-yi Talim o Tahqiq

مجلہ تعلیم و تحقیق

Markaz Talim o Tahqiq, Gulshan-e-Taleem, Sector H-15, Islamabad, Pakistan

مرکز تعلیم و تحقیق، گلشنِ تعلیم، ایچ۔۱۵، اسلام آباد، پاکستان

ISSN (P): 2618-1355, ISSN (Online): 2618-1363

Issue 4, Vol 7 , October-December,2025

شمارہ ۴، جلد ۷، اکتوبر—دسمبر، ۲۰۲۵

اسلام میں شہریت کا تصور: متقدمین فقہاء کی آراء کا تجزیاتی مطالعہ

The Concept of Citizenship in Islam:An Analytical Study of the opinions of Classical Jurists.

Muhammad Rehan khan[1]

Abstract:

The notions of citizenship occupy a central position in Islamic political and legal thought. This paper undertakes an analytical study of the perspectives of classical Muslim jurists (fuqahāʾ al-mutaqaddimīn) concerning the foundations of citizenship, and the legal status of its inhabitants. The research critically examines juristic formulations related to dār al-Islām and dār al-ḥarb, the principles of allegiance (bayʿah) regarding non-Muslim citizens, the differentiation of Muslim and non-Muslim citizenship. By engaging with the writings of prominent jurists such as Abū Ḥanīfah, al-Shāfiʿī, Mālik, and Ibn Ḥanbal, as well as their successors, the study reveals both convergences and divergences in the classical legal discourse. The findings suggest that the juristic understanding of citizenship was not static but contextually responsive, reflecting the socio-political realities of the time. This investigation contributes to contemporary scholarship by reassessing the relevance of classical juristic insights for present-day debates on political identity, governance, and civic belonging within Muslim societies.

Keywords: Islamic State, Citizenship in Islam, Classical Jurists, Dār al-Islām and Dār al-Ḥarb, Bayʿah, Islamic Political Thought, Governance and Justice

[1] - PhD Scholar, Dept of Islamic Thought and Culture, NUML, Islamabad,

rehan59111@gmail.com

تعارف:

ایسا علاقہ جس میں انسان بستے ہوں، اور اس کی اطراف کی حد بندی کر کے ممتاز کر دیا گیا ہو، وہ اس علاقے میں بسنے والے شہریوں کی ریاست کہلاتی ہے۔([2]) ریاستوں کا تصور قدیم زمانہ سے ہی چلا آرہا ہے۔ تاہم انیسویں صدی میں قومی ریاستوں کا تصور وجود میں آیا، جس کے بعد ریاست کا تصور اور ریاست کے اپنے شہریوں کے ساتھ معاملات بھی قومیت کی بنیاد مختلف ہوتے چلے گئے۔ اسلام میں جدید قومی ریاستوں کی بنیاد پر وجود میں آنے والا شہریت کا تصور تو موجود نہیں ہے۔ تاہم فقہاء اور مفکرین نے اسلامی اصولوں کی تشریح و تعبیر کرتے ہوئے اسلام میں شہریت کا تصور بیان کیا ہے، اور اسی تصور کی بنیاد پر شہریت کی تقسیم شہریوں کی بنیاد پر کی ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ شہریت کی تقسیم شہریوں کی ذات کے بجائے ان کے مذہب کے اعتبار سے کی ہے، تو بجا ہو گا۔ لہذا اس بنیاد پر متقدمین نے شہریت کی تقسیم کسی بھی شہری کے مسلمان یا غیر مسلم ہونے کے اعتبار سے کی ہے، اور اسی بناء پر پھر ریاست کی بھی تقسیم کر کے ریاست کے اعتبار سے مسلم و غیر مسلم شہریوں کے احکام بیان کئے ہیں۔ متقدمین فقہاء کی شہریت کے تصور کو دیکھا جائے، تو وہ موجودہ شہریت کے تصور سے بالکل مختلف ہے۔ اس میں نہ تو رنگ، نسل اور لسان کا تعلق ہے، اور نہ ہی کسی کی ذات پات کا۔ بلکہ ان کے نزدیک شہریت کی بنیاد اسلام و غیرِ اسلام پر ہے، اور اسی بنیاد کا اثر اسلامی ریاست میں بسنے والے مسلم و غیر مسلم شہریوں کے نہ صرف حقوق پر ہوتا ہے، بلکہ ان کی شہریت پر بھی ہوتا ہے۔

اسلامی تعلیمات میں شہریت کا تصور:

اسلام میں شہریت کے تصور کی کھوج لگائی جائے، تو مسلمانوں کی ریاست ریاست مدینہ کے ساتھ ہی وجود میں آچکی تھی۔ ریاست مدینہ میں مسلم و غیر مسلم دونوں طرح کے شہری آباد تھے۔ اسلامی تاریخ میں میثاقِ مدینہ ایسا معاہدہ ہے، جس پر عصرِ حاضر میں کئی لوگ شہریت کے تصور کا جائزہ لیتے ہیں، اور اسی میثاقِ مدینہ کی بنیاد پر ہی مسلم و غیر شہری کی نہ صرف تقسیم کرتے ہیں، بلکہ ان کے حقوق کا بھی جائزہ اسی تناظر میں لیا جاتا ہے۔([3]) تاہم مسلم کلاسیکی قانون کا جائزہ لیا جائے، تو شہریت کا یہ تصور اتنا سیدھا نظر نہیں آتا۔ مسلم کلاسیکی قانون میں فقہاء نے شہریت کی تقسیم مسلم و غیر شہری کے اعتبار سے کی ہے۔ ابتداء میں مسلم فقہاء مسلم و غیر مسلم کی بنیاد پر ریاست کا تصور پیش کرتے ہیں، پھر اسی ریاست کی تقسیم کی بنیاد پر ریاست میں بسنے والے شہریوں کی تقسیم مسلم و غیر مسلم شہری کے اعتبار سے کرتے ہیں۔ ذیل میں مسلم فقہاء و مفکرین کا ریاست کے تصور اور اس کے ساتھ اس بنیاد پر قائم ہونے والے شہریت کے تصور پر تفصیلا بحث کی جاتی ہے۔

ا۔ دارالاسلام:

دارالاسلام کا تصور تاریخی اعتبار سے اگرچہ ریاستِ مدینہ کے ساتھ ہی وجود میں آچکا تھا، اور فتح مکہ کے بعد فتح مکہ کو دارالاسلام قرار دینے کی کئی امثلہ محدثین سے ملتی ہیں۔ اسی بناء پر فقہاء اور محدثین نے دارالاسلام کا تصور پیش کیا ہے۔

1. احناف کے نزدیک دارالاسلام کی متفق علیہ تعریف یہ کی گئی ہے کہ روئے زمین کا ہر وہ ٹکڑا جہاں اسلامی احکام کا ظہور ہو۔ اسی مفہوم کو بیان کرتے ہوئے علامہ کاسانی متوفی 587ھ ذکر کرتے ہیں کہ:

[2] Oppenheim, Lassa. International Law: A Treatise, Volume 1: Peace. 8th ed. Edited by Hersch Lauterpacht. London: Longmans, Green and Co., 1955.

[3] Muhammad Hamidullah, The First Written Constitution (Lahore: Ashraf Printing House, 1994). Pp 94

"لا خلاف بين أصحابنا في أن دار الكفر تصير دار إسلام بظهور أحكام الإسلام فيها "[4]

ترجمہ: ہمارے اصحاب کے مابین اس بارے میں اختلاف نہیں ہے کہ دار کفر میں اسلامی احکام کے ظہور کے بعد وہ دار اسلام بن جاتا ہے۔

2. ابن عابدین شامی نے بھی دار الاسلام کی تعریف میں اسلامی احکام بالخصوص مسلمانوں کے اجتماعی امور کے اجراء کو ہی دار الاسلام کی بنیاد قرار دیا ہے۔ جیسا کہ جمعہ اور عیدین وغیرہ کا قیام۔ چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

"ودار الحرب تصير دار الإسلام بإجراء أحكام أهل الإسلام فيها كجمعة وعيد وإن بقي فيها كافر أصلي وإن لم تتصل بدار الإسلام درر"[5]

ترجمہ: اہل اسلام کے احکام جیسا کہ جمعہ اور عیدین وغیرہ کے قیام کے بعد دار الحرب دار الاسلام میں تبدیل ہو جاتا ہے، اگرچہ وہاں غیر مسلم بھی موجود ہوں، اور وہ علاقہ دار الاسلام کے ساتھ متصل بھی نہ ہو۔

3. احناف کے علاوہ شافعیہ نے دار الاسلام کی تعریف کچھ اس طرح سے کی ہے کہ ہر وہ سرزمین جہاں احکام اسلام کا ظہور ہو، یہاں تک تو شافعیہ حنفیہ کے ساتھ ہی ہیں۔ تاہم شافعیہ کے نزدیک اسلامی احکام کے ظہور کا مطلب یہ ہے کہ عبادات کے علاوہ دیگر اسلامی احکام جیسے زنی کی حرمت، چوری کی ممانعت وغیرہ جیسے شرعی ممنوعات کا ریاستی بنیاد پر اظہار ہو۔ اس کے علاوہ کوئی ایسا علاقہ کہ جہاں مسلمان آباد ہو جائیں، اور ان کے ساتھ غیر مسلم اقلیت میں ہوں، تو وہ علاقہ بھی دار الاسلام کے زمرے میں آتا ہے۔ اسی طرح جنگ کے نتیجے میں مسلمانوں کے پاس فتح کے بعد آنے والا علاقہ بھی دار الاسلام کے زمرے میں آتا ہے۔[6]

فقہاء کی آراء سے دار الاسلام کا جو تصور وجود میں آتا ہے، وہ یہ ہے کہ ایسا علاقہ جہاں مسلمان چاہے تھوڑے ہوں یا زیادہ، اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں لیکن اگر اس علاقہ میں مسلمان فیصلہ کن حیثیت کے حامل ہیں، تو وہ علاقہ دار الاسلام کہلائے گا، اور اگر کسی علاقہ میں مسلمان بے شک تعداد میں دیگر غیر مسلموں سے زیادہ ہوں، لیکن ان کی اس علاقہ میں حیثیت فیصلہ کن نہ ہو، تو وہ دار الاسلام نہیں کہلائے گا۔ فیصلہ کن حیثیت کا مطلب یہ ہے سیاسی اعتبار سے مسلمان اتنے مضبوط ہوں کہ وہ احکام اسلام کے مطابق فیصلے کر سکیں۔[7]

محدثین اور فقہاء نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ آنے کے بعد مدینہ میں اسلامی احکام کے قیام اور بعد میں مکہ کے فتح ہونے کے بعد اس پر مسلمانوں کا غلبہ ہونے کے ساتھ مکہ میں اسلامی احکام کے اجراء کی بنیاد پر مذہب اسلام اور مسلم شہریوں کی اکثریت کی بنیاد پر بننے والی ریاست کو دار الاسلام کا نام دیا۔ گو کہ لفظ دار الاسلام بعض احادیث میں بھی ملتا ہے۔ جیسا کہ المعجم الکبیر میں ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ آتے ہیں:

"عُقْرُ دَارِ الْإِسْلَامِ بِالشَّام"[8]

ترجمہ: دار الاسلام کی جڑیں شام کے ساتھ منسلک ہیں۔

---

[4] **کاسانی، علاء الدین، بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع (دار الکتب العلمیة، الطبعة الثانیة 1986) ج7ص130**

[5] **شامی، ابن عابدین، الدر المختار وحاشیة ابن عابدین ج 4ص175**

[6] الشافعی، محمد بن ادریس، **الام** (بیروت، الطبعة الاولیٰ 1990) ج7ص326

[7] غازی، ڈاکٹر محمود احمد، اسلام کا قانون بین الممالک (اسلام آباد، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اشاعتِ اول 2007) ص275

[8] طبرانی، سلیمان بن احمد، **المعجم الکبیر** (القاهرة مکتبة ابن تیمیة —، الطبعة الثانیة) رقم 6359

اسی طرح مشہور امام حدیث امام بیہقی رحمہ اللہ متوفی 458ھ نے اپنی کتاب میں شوہر کے اسلام لانے کے بعد بیوی کے کفر پر باقی رہنے کی صورت میں نکاح کے برقرار رہنے یا نہ رہنے کی بحث کے ضمن میں مکہ کے فتح سے قبل دار الحرب اور فتح ہونے کے بعد دار الاسلام ہونے کا ذکر کیا ہے۔([9])

واضح ہوا کہ اسلامی تناظر میں اسلامی احکام کے بالعموم اور موانعات کے بالخصوص اظہار کے بعد کوئی بھی علاقہ دار الاسلام کہلاتا ہے، اور یہ اسی وقت ممکن ہوگا جب اس علاقہ میں رہنے والے باشندے مسلم شہری ہوں، اور ان شہریوں کی سیاسی طاقت اتنی ہو کہ وہاں فیصلہ کن حیثیت کے حامل ہوں۔ لہذا سیاسی طاقت کے اعتبار سے مسلم شہری ہونے کی بنیاد پر ہی ریاست کی تقسیم میں ایک قسم دار لاسلام کی ہے۔

دار الاسلام کے ساتھ غیر مسلم شہریوں کا تعلق:

اسلامی تناظر میں دیکھا جائے تو دار لاسلام کے ساتھ غیر مسلموں کی ایک خاص قسم کا تعلق ضرور رہتا ہے۔ یہ تعلق دار الاسلام میں بسنے کی خواہش رکھنے والے غیر مسلموں کے ریاست کے ساتھ عقد کے ذریعے وجود میں آتا ہے۔ اس عقد کے بعد غیر مسلم شہری دار الاسلام کی شہریت حاصل کر کے دار الاسلام کے غیر مسلم شہری بن جاتے ہیں۔ دار الاسلام میں بسنے والے ایسے شہریوں کو ''ذمی'' یا ''اہل الذمہ'' کہا جاتا ہے، اور جس عقد کے ذریعے وہ شہری بنیں، اسے عقدِ ذمہ کہا جاتا ہے۔

فقہاء اور محدثین کی اصطلاح میں دیکھا جائے، تو ذمی یا اہل الذمہ وہ لوگ کہلاتے ہیں کہ جن کو ریاست کے امیر، خلیفہ یا حکمران یا اس کے نمائندہ کے ساتھ عہد (Agreement) ہو جائے، اور اس عہد کی بنیاد پر ریاست کے ذمہ ان کے بعض حقوق جیسے حقِ آزادی مذہب، حق آزادی کسبِ معاش، آزادی نقل و حرکت، ان کے جان مال کی حفاظت وغیرہ لازم ہو جاتے ہیں۔ اسی معاہدہ کے ساتھ ان پر بھی ریاست یعنی دار الاسلام کے قوانین کی پاسداری لازم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فقہی انسائیکلوپیڈیا ''الموسوعة الفقهية الكويتية'' میں دار الاسلام میں غیر مسلم شہری کے ساتھ اسی عقدِ ذمہ کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

''الذمة في اصطلاح الفقهاء الذميون، والذمي نسبة إلى الذمة، أي العهد من الإمام – أو ممن ينوب عنه – بالأمن على نفسه وماله نظير التزامه الجزية ونفوذ أحكام الإسلام''[(10)]

ترجمہ: فقہائے کی اصطلاح میں ذمہ سے مراد ذمیوں کو لیا جاتا ہے، اور ذمی کی نسبت لفظ ذمہ سے ہے، جس کا معنیٰ امام یا اس کے نائب کی جانب سے ذمی کی جان و مال کی حفاظت کا معاہدہ ہے، جس کی بدلے ذمی جزیہ ادا کرنے اور ریاستی احکام کی پابندی کرے گا۔

مذکورہ مختصر تمہید کے بعد یہ بات واضح ہوئی کہ دار الاسلام کے اندر رہنے والے غیر مسلم شہری ریاست کے ساتھ ایک معاہدہ کرتے ہیں، جس کی بنا پر ریاست انہیں ان کی جان مال کی حفاظت فراہم کرتی ہے، اور اس کے بدلے وہ ریاست کو جزیہ ادا کرنے اور ریاست کے قوانین کی پاسداری کرنے کے پابند ہوتے ہیں۔ دار الاسلام کے ساتھ تعلق رکھنے والے غیر مسلم شہریوں، ان کے عقدِ ذمہ پر مزید بحث فصل دوم میں تفصیل کے ساتھ آتی ہے۔

---

[9] بيهقي،احمد بن حسين،**السنن الصغير**(كراتشي . جامعة الدراسات الإسلامية، ،الطبعة الاولىٰ 1989)رقم 2476

[10] مجموعة من المولفين،1404ھ **الموسوعة الفقهية الكويتية**، الكويت وزارة الأوقاف والشئون الإسلامية، ،ج7ص104 مادة:اهل الحرب

دارالحرب اور دارالکفر:

''دارالحرب'' دو لفظوں سے مرکب ہے، جس کے معنی ہیں، جنگ کا گھر۔ لہذا فقہاء کی اصطلاح میں دارالحرب اس علاقہ کو نہیں کہا جاتا ،جو مسلمانوں کے ساتھ بر سر جنگ ہو، بلکہ ہر وہ علاقہ جہاں احکامِ اسلام کے بجائے احکامِ کفر کا ظہور ہو۔ اسی کو فقہاء دارالحرب کے ساتھ دارالکفر سے بھی موسوم کرتے ہیں([11]) فقہاء نے دارالحرب کو جن معنوں میں استعمال کیا ہے، ان سے یہ بات متبادر ہوتی ہے کہ ہر وہ علاقہ جہاں اسلام کے احکام کا ظہور نہ ہو، یعنی وہ علاقہ جو دارالاسلام کے بالکل برعکس ہو۔ اس میں مسلمان تعداد میں زیادہ ہوں یا تھوڑے، اقلیت میں ہوں یا اکثریت میں ،ان کو اگر اس علاقہ میں فیصلہ کن حیثیت حاصل نہیں ہے، تو وہ علاقہ فقہاء کے نزدیک دارالحرب اور دارالکفر کہلاتا ہے۔

دارالکفر جس کو فقہاء دارالحرب کے لفظ سے بھی تعبیر کرتے ہیں، کے بارے میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ دارالکفر کی تعریف کیا ہے۔ اسی تعریف کے اختلاف کا اثر دورِ حاضر میں بھی موجودہ ریاستوں کی تطبیق کے وقت بھی نمایاں نظر آتا ہے۔

1. امام ابو حنیفہ کے نزدیک دارالکفر اس مقام یا اس علاقہ کو کہا جاتا ہے جہاں مسلمانوں کو مطلقاً امن حاصل نہ ہو۔

چنانچہ ابن ہمام 861ھ فرماتے ہیں:

'' لأن دار الحرب تصير دار إسلام بثبوت الأمن للمقيم من المسلمين فيها ''([12])

ترجمہ: کیونکہ اس علاقے میں بسنے والے مسلمانوں کو امن حاصل ہونے پر دارالحرب دارالاسلام کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

2. احناف میں سے امام محمد، امام ابو یوسف اور امام مالک کے نزدیک دارالکفر ایسا مقام یا علاقہ ہوتا ہے جہاں احکامِ کفر کا ظہور ہو چکا ہو۔

چنانچہ ابن عابدین شامی 1252ھ لکھتے ہیں:

وقالا: بشرط واحد لا غير وهو إظهار حكم الكفر وهو القياس([13])

ترجمہ: امام ابو یوسف اور امام محمد نے فرمایا کہ دارالحرب کی ایک ہی شرط ہے اور وہ احکامِ کفر کا ظہور ہونا ہے، ان کا یہ قول قیاس پر مبنی ہے۔

اور امام مالک متوفی 179ھ اپنی شہرہ آفاق کتاب ''المدونہ'' میں فرماتے ہیں:

''کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اپنے آقا سے پہلے ہی اسلام لے آئے تھے، پھر ان کو حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ خرید کر آزاد کر دیا، اس وقت مکہ دارالحرب تھا کیونکہ وہاں احکامِ جاہلیت عام تھے۔([14])

3. دارالحرب کی تیسری تعریف متاخرین احناف کی ہے، ان کے نزدیک دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف کسی علاقہ کے منتقل ہونے کے لئے تین شرائط کا پایا جانا لازمی ہے، اگر ان میں سے ایک شرط بھی نہ پائی جائے، تو وہ علاقہ دارالحرب کہلائے گا۔ پہلی یہ کہ احکامِ کفریہ کا ظہور ہونا، دوسری یہ کہ اس کی سرحد دوسرے دارالکفر سے ملی ہوئی ہو، تیسری یہ کہ کسی مسلمان یا ذمی کو وہاں امان حاصل نہ ہو۔

اس قول کا ذکر کرتے ہوئے ابن عابدین شامی رقمطراز ہیں:

---

[11] **مجموعة من المولفين، الموسوعة الفقهية الكويتية، ج20ص206 مادة: دارالحرب،**

[12] **ابن همام، كمال الدين، فتح القدير (دارالفكر) ج5ص480**

[13] شامی، ابن عابدین ،**الدر المختار وحاشية ابن عابدين** ج 4ص175

[14] مالک بن انس، **المدونة** (بیروت، دار الکتب العلمیة، الطبعة الاولیٰ 1994) ج1ص511

"لا تصير دار الإسلام دار حرب إلا بأمور ثلاثة: بإجراء أحكام أهل الشرك، وباتصالها بدار الحرب، وبأن لا يبقى فيها مسلم أو ذمي آمنا بالأمان الأول على نفسه"[15]

ترجمہ: دارالاسلام کو دار حرب میں تبدیل ہونے کے لیے تین امور ضروری ہیں، اول، اہل شرک کے احکام کا نفاذ، دوم، دارالحرب کے ساتھ اس کا اتصال، سوم، اس میں کوئی مسلمان یا ذمی ایسا نہ ہو جو پہلے امن کی حالت میں اپنی جان کی حفاظت کر رہا ہو، یعنی اُسے پناہ یا امان دی گئی ہو۔ میرے نزدیک اس مسئلہ میں امام ابو حنیفہ کی رائے درست ہے، جس کے مطابق دارالحرب وہ علاقہ کہلاتا ہے، جہاں مسلمانوں کو مطلقاً امان حاصل نہ ہو، اگر اس علاقہ یا ملک کی جانب سے مسلمانوں کو مطلقاً امان حاصل ہو جائے، تو علاقہ دارالحرب نہیں کہلائے گا۔

دارالاسلام اور دارالکفر کا جدید مفہوم:

دارالاسلام اور دارالکفر کی قدیم تعریفات میں کہیں بھی حاکم کے مسلم یا غیر مسلم کے ہونے کا ذکر نہیں ملتا، قدیم تعریفات میں احکامِ اسلام یا احکام کفر کا ظہور یا پھر مسلمانوں کو امان حاصل ہونے یا نہ ہونے پر دارالاسلام یا دارالکفر کا مدار رکھا گیا ہے۔ گو کہ متقدمین کی عبارات میں احکام اسلام کے ظہور میں یہ بات پنہاں ہے کہ وہاں مسلمانوں کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو، اور وہ اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے، جب وہاں کا حاکم مسلمان ہو۔ جدید تعریفات میں جو ایک نمایاں فرق نظر آتا ہے وہ مسلمانوں کی طاقت ہونے یا نہ ہونے اور حاکم کے مسلمان یا غیر مسلم ہونے کی بناء دارالاسلام اور دارالکفر کا مدار نظر آتا ہے۔

چنانچہ شیخ ابوزہرہ متوفی 1995ء فرماتے ہیں:

"دارالاسلام وہ ریاست ہے کہ جہاں کا حاکم مسلمان ہو، اور اس ریاست میں طاقت، قوت اور غلبہ مسلمانوں کا ہو۔"[16]

اسی طرح دارالکفر کے بارے میں بھی ابوزہرہ نے دونوں آراء کا ذکر کیا ہے کہ ایک رائے کے مطابق دارالحرب میں صرف اس بات کا ہونا کافی ہے کہ وہاں مسلمانوں کی طاقت نہ ہو، اور وہاں کا حاکم مسلمان نہ ہو، پھر شیخ ابوزہرہ نے امام ابو حنیفہ کے قول کو ذکر کر کے اس کو ہی ترجیح دی ہے کہ ضروری ہے کہ مسلمانوں کے غلبہ کے ساتھ وہاں مسلمانوں کو امان بھی حاصل ہو۔ اس لئے جہاں مسلمانوں کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو، لیکن وہاں مسلمانوں کے لئے امن نہ ہو، تو اس کو شیخ ابوزہرہ دارالسلم کہتے ہیں نہ کہ دارالاسلام۔[17]

دارالصلح ودارالعہد:

دارالصلح دو الفظوں سے مرکب ہے۔ ایک دار اور دوسرا صلح۔ عربی زبان میں دار کے معنی گھر کے اور صلح کے معنی مصالحت، وعدہ صلح کے آتے ہیں۔ یوں دونوں الفاظ کے مجموعہ کے صلح کے گھر کے ہوئے۔[18] اصطلاحی اعتبار سے فقہاء نے دارالصلح اس علاقہ یا ریاست کو کہا ہے کہ ہر وہ علاقہ یا ریاست کہ جس کے باشندوں کے ساتھ مسلمان حاکم ترکِ قتال پر صلح کر لے۔ اسی کو فقہاء دارالموادعہ، دارالصلح اور دارالمعاہدہ کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔[19]

---

[15] شامی، ابن عابدین، **الدر المختار وحاشية ابن عابدين** ج 4ص175

[16] ابو زهره، محمد، **العلاقات الدولية فى الاسلام**(دار الفكر العربى 1995ء)ص 56

[17] ابو زهره، محمد، **العلاقات الدولية فى الاسلام** ص 57

[18] زبيدى، محمد بن محمد، **تاج العروس**(دار الهداية)ج38ص5 مادة:غهد

[19] كاسانى، علاء الدين، **بدائع الصنائع فى ترتيب الشرائع** ج7ص132

متقدمین فقہاء کی کتب کو دیکھا جائے، توانہوں نے دار الصلح کی اصطلاح کو اپنی کتب میں استعمال نہیں کیا، یا اگر کہیں کیا بھی ہے، تو بہت شاذ و نادر ہی۔ اس کے بجائے متقدمین نے دار الموادعہ کی اصطلاح اسی معنی میں استعمال کی ہے۔ چنانچہ محمد بن حسن شیبانی نے شرح السیر الکبیر میں دار الموداعہ کی اصطلاح استعمال کر کے بیشتر مسائل کو بیان کیا ہے([20]) اسی طرح علامہ علاء الدین کاسانی نے بدائع الصنائع میں بھی دار الموداعہ کی اصطلاح دار الصلح کے لئے ہی استعمال کی ہے۔ چنانچہ امام کاسانی فرماتے ہیں:

والثاني، الموادعة وهي: المعاهدة والصلح على ترك القتال([21])

ترجمہ: امان کی دوسری قسم موادعہ کی ہے، جو کہ صلح اور باہمی جنگ کے ترک کرنے کے معاہدے کا نام ہے۔

متقدمین کے بعد والے فقہاء میں سے دو حضرات ایسے ہیں، جنہوں نے اپنی کتب میں ''دار العہد'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ پہلی شخصیت علامہ ابن رفعہ احمد بن محمد انصاری المتوفی 710ھ ہیں۔([22]) دوسری شخصیت علامہ ابن قیم المتوفی 751ھ ہیں، جنہوں نے اپنی شہرہ آفاق کتاب 'احکام اھل الذمہ'' میں دار العہد کی اصطلاح استعمال کی ہے۔([23])

متاخرین کے بعد دورِ حاضر کے حضرات میں لفظ دار العہد ہی دار الموادعہ اور دار الصلح کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ جیسا کہ شیخ ابو زہرہ متوفی 1995ء نے بھی دار العہد کو دار الصلح کے معنوں میں ہی استعمال کیا ہے۔([24]) اور فقہ مقارن کے شہرہ آفاق انسائیکلوپیڈیا ''الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ'' میں بھی دار لعہد مادہ کے تحت دار الصلح اور دار الموادعہ کے تمام مسائل بیان ہوئے ہیں۔([25])

دار العہد کا تصور قدیمی دور میں اس وقت سامنے آیا، جب قبائلی نظام موجود تھا۔ قبائلی نظام میں اکثر و بیشتر بعض قبائل کی آپس میں دشمنی ہوا کرتی تھی، اور یہ دشمنی خون خرابے کا باعث بنتی تھی۔ جب خون خرابا حد سے بڑھ جاتا تھا، یا قبائل میں آپسی بڑی جنگ کا خطرہ ہوتا تھا، تو قبائل آپس میں ترکِ جنگ پر صلح کرتے تھے۔ یہ ایک طرح کا دو یا دو سے زیادہ قبائل کے مابین معاہدہ ہوتا تھا، جس میں کچھ شرائط فریقین کی طرف سے رکھی جاتی تھیں۔ شرائط میں ترکِ قتال کے علاوہ کسی بیرونی دشمن کے حملہ آور ہونے کے وقت اس کو تحفظ فراہم کرنے کی شرط بھی شامل ہوتی تھی۔ پھر جو قبیلہ مضبوط ہوتا تھا، وہ ترکِ جنگ کی صلح پر دوسرے قبیلے سے سالانہ بنیادوں پر مال بھی وصول کیا کرتا تھا۔ کیونکہ اس نے دوسرے قبیلے کو دشمن سے تحفظ بھی فراہم کرنا ہوتا تھا۔

اسلامی تاریخ میں دیکھ جائے، تو سب سے پہلا موادعہ یا صلح، صلح حدیبیہ کی تھی، جس کے بارے میں مسند احمد میں یہ الفاظ سامنے آتے ہیں کہ:

'' وادع رسول الله صلى الله عليه وسلم المشركين يوم الحديبية على ثلاث ''

''آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین سے حدیبیہ کے دن تین شرائط موادعت کی۔''([26])

قبیلہ نجران کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح کا معاہدہ کیا تھا۔

ابو داؤد میں ہی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے یہ مروی ہے کہ:

---

[20] شیبانی، محمد بن حسن، **شرح السیر الکبیر**(بیروت، دار الکتب العلمیۃ الطبعۃ الاولیٰ 1997) ج5ص11

[21] کاسانی، علاء الدین، **بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع** ج7ص133

[22] ابن رفعۃ، احمد بن محمد، **کفایۃ النبیہ في شرح التنبیہ**(بیروت دار الکتب العلمیۃ، الطبعۃ الاولیٰ 2009ء) ج5ص496

[23] جوزیۃ، ابن قیم، **احکام اھل الذمۃ**(الدمام، رمادی للنشر الطبعۃ الاولیٰ 1997ء) ج3ص1229

[24] ابو زھرہ، محمد، العلاقات **الدولیۃ فی الاسلام** ص 56

[25] مجموعۃ من المولفین، **الموسوعۃ الفقھیۃ الکویتیۃ**، ج20ص217

[26] شیبانی، احمد بن حنبل، **مسند احمد**(مؤسسۃ الرسالۃ الطبعۃ الاولیٰ 2001ء) رقم الحدیث 18683

" صَالَحَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَهْلَ نَجْرَانَ عَلَى أَلْفَيْ حُلَّةٍ، النِّصْفُ فِي صَفَرٍ، وَالْبَقِيَّةُ فِي رَجَبٍ، يُؤَدُّونَهَا إِلَى الْمُسْلِمِينَ، وَعَوَرِ ثَلَاثِينَ دِرْعًا، وَثَلَاثِينَ فَرَسًا، وَثَلَاثِينَ بَعِيرًا، وَثَلَاثِينَ مِنْ كُلِّ صِنْفٍ مِنْ أَصْنَافِ السِّلَاحِ، يَغْزُونَ بِهَا، وَالْمُسْلِمُونَ ضَامِنُونَ لَهَا حَتَّى يَرُدُّوهَا عَلَيْهِمْ، إِنْ كَانَ بِالْيَمَنِ كَيْدٌ أَوْ غَدْرَةٌ عَلَى أَنْ لَا تُهْدَمَ لَهُمْ بَيْعَةٌ، وَلَا يُخْرَجَ لَهُمْ قَسٌّ، وَلَا يُفْتَنُوا عَنْ دِينِهِمْ مَا لَمْ يُحْدِثُوا حَدَثًا، أَوْ يَأْكُلُوا الرِّبَا "[27]

"آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران سے دو ہزار حلوں پر صلح کا معاہدہ کیا، جن میں سے آدھا صفر میں اور آدھا ماہِ رجب میں دینا طے پایا، جو کہ وہ مسلمانوں کو ادا کریں گے۔ اسی کے ساتھ تیس درع، تیس گھوڑے، تیس اونٹ اور ہر طرح کے تیس تیس ہتھیار مسلمانوں کو عاریتاً دیں گے۔ اس کے بدلے مسلمان انہیں ان کی جان اور مال کا تحفظ فراہم کریں گے۔ اس معاہدہ میں یہ شرائط تھیں کہ نہ تو ان کے کسی عبادت خانے کو ڈھایا جائے گا، ان کے کسی مذہبی رہنما کو نہیں نکالا جائے گا، اور ان میں سے کسی کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کیا جائے۔ یہ معاہدہ اس وقت تک باقی رہے گا جب تک کہ وہ نیا کوئی مسئلہ نہ اٹھادیں یا پھر سود نہ کھالیں۔"

حضرت ابو عبیدہ بن جراح نے حمص کے لوگوں سے بھی اسی طرح کا معاہدہ کیا تھا۔[28]

دار العہد کی نوعیت:

دار العہد کی اتنی تعریف میں تو فقہاء کا اتفاق ہے کہ دار العہد ایسے علاقہ کو کہا جاتا ہے کہ جس کے ساتھ مسلمان حاکم ترکِ قتال پر مصالحت کرلے۔ جیسا کہ پہلے گزرا۔ تاہم اس بارے میں فقہاء کا اختلاف ملتا ہے کہ مصالحت کس نوعیت کی ہوگی؟ کیا مصالحت کے بعد ان کا علاقہ اور ریاست بھی مسلمان حاکم کے زیرِ نگرانی ہوگی؟ اور کیا اس زمین پر اسلامی احکام کا نفاذ ہی لازم ہوگا یا ان کا اپنا قانون بھی ان کی زمین میں ہو سکتا ہے؟

سب سے پہلے فقہاء کی بیان کردہ اصطلاحی تعاریف کا ذکر کیا جاتا ہے، تاکہ ان کے اختلاف کو سمجھنے میں آسانی ہو سکے۔ فقہاء نے اس طرح کے صلح کے معاملے کے لئے ایک اور لفظ "ھدنہ" استعمال کیا ہے۔ احناف کے نزدیک عقدِ ھدنہ یہ کہ ایک خاص مدت تک مال کے عوض یا بنا مال کے عوض ترکِ قتال پر معاہدہ کرنا، جب مسلمانوں کا حکمران اس میں کسی مصلحت کو سامنے رکھے۔[29] مالکیہ کے نزدیک ھدنہ ایسا عقد ہے جو کہ مسلم کسی غیر مسلم کے ساتھ ایک خاص مدت تک ترک قتال پر کرتا ہے، جس میں وہ غیر مسلم اسلام کے قوانین کے ماتحت نہیں رہتا۔[30] شافعیہ کے نزدیک ھدنہ ایک ایسا معاملہ ہے جو غیر مسلم ریاست کے ساتھ ایک خاص مدت تک کے لئے کسی عوض کے ساتھ یا بنا عوض کے ترکِ قتال کا معاہدہ ہے۔[31] حنابلہ کے نزدیک یہ ایک ایسا عقد ہے جو حکمران یا اس کے نائب کی جانب سے غیر مسلموں کے ساتھ ضرورت کے تحت مخصوص مدت کے لئے قتال کا ترک کرنا ہے۔[32]

---

[27] سجستانی، ابو داود، **سنن ابی داود**، رقم 3041

[28] سجستانی، ابو داود، **سنن ابی داود**، رقم 3045

[29] موصلی، عبد اللہ بن محمود، **الاختیار لتعلیل المختار** (القاهرة مطبعة الحلبي-1937ء) ج4ص120

[30] طرابلسی، محمد بن محمد، **مواهب الجليل في شرح مختصر خليل** (دار الفكر، الطبعة الثالثة 1997ء) ج1ص269

[31] شیربینی، محمد بن احمد الخطیب، **مغنی المحتاج الی معرفة معانی الفاظ المنهاج** (بیروت دار الکتب العلمیة، الطبعة الاولیٰ 1994ء) ج4ص260

[32] البهوتی، منصور بن یونس، **کشاف القناع عن متن الإقناع** (بیروت، دار الکتب العلمیة) ج3ص111

فقہاء نے اہل حرب یعنی دار الاسلام کے علاوہ بقیہ خطہ زمین پر موجود علاقوں اور ریاستوں کے ساتھ عقدِ صلح اور عقد عہد کی بھی دو قسمیں بیان کی ہیں، ان دو قسموں کو سامنے رکھتے ہوئے ہی دار العہد کی دونوں نوعیتیں سامنے آئیں گی۔ پہلی قسم یہ ہے کہ عقدِ صلح میں اس بات کی شرط لگائی جائے کہ غیر مسلموں کی سرزمینیں مسلمانوں کی ہوں گی، اور مسلمان ان کو ان کی سرزمینوں میں صرف رہنے کی اجازت دیں گی، جس کے بدلے وہ مسلمانوں کو خراج بھی ادا کریں گے۔ اس قسم کے معاہدہ کے تحت ان کی سرزمینیں دار الاسلام کا حصہ بن جائیں گی، اور ان سرزمینوں میں دار الاسلام والے احکامات ہی جاری ہوں گے، جن کے مطابق ان زمینوں میں نہ تو غیر مسلموں کا کوئی نیا عبادت خانہ تعمیر کروایا جائے گا، اور نہ ہی شہری علاقوں میں ان کو ان کے مذہبی شعائر کے اظہار کی آزادی ہو گی، اور وہ اپنی سرزمینوں میں بھی اسلامی قوانین کے پابند ہوں گے۔ ([33])

دوسری قسم یہ ہے کہ عقدِ صلح میں یہ شرط ہو کہ غیر مسلموں کی زمینیں ان ہی کی رہیں گی، اور مسلمان ان کو تحفظ مالی عوض یا بنا مالی عوض کے تحفظ فراہم کریں گے۔ اس طرح کا معاہدہ کرنا احناف کے علاوہ باقی تمام فقہاء کے نزدیک جائز ہے۔ اس معاہدہ کے بعد وہ اپنی ریاست میں اپنے مذہب اور اپنے قانون میں آزاد ہوں گے۔ وہ اپنی ریاست میں شراب، اور دیگر محرمات کی بھی خرید و فروخت کر سکتے ہیں، اپنے مذہبی شعائر کا کھل کر اظہار کر سکتے ہیں۔ اپنی ریاست میں نئے عبادت خانے تعمیر کر سکتے ہیں، اور اپنے قوانین کو اپنی ریاست کے اندر لاگو کر سکتے ہیں۔ یوں اس معاہدہ کے بعد ان کی ریاست دار اسلام نہ کہلائے گا، بلکہ وہ دار العہد ہو گا۔ ([34]) احناف کے نزدیک اس دوسری قسم کا معاہدہ کرنا جائز نہیں، الا یہ کہ مسلمان کمزور ہو جائیں، اور ان کے اندر طاقت اور قوت نہ ہو کہ وہ غیر مسلم ریاست کا مقابلہ کر سکیں۔ اس صورت میں بامر مجبوری وہ اس بات کی صلح کر سکتے ہیں کہ غیر مسلموں کی زمینیں اور ان پر قانون انہی کا رہے گا۔ اسی بات کو امام کاسانی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں کہ:

"هذا إذا وقع الصلح على أن يكونوا مستبقين على أحكام الكفر" ([35])

ترجمہ: یہ وہ صورت ہے کہ جب صلح اس شرط پر ہو کہ غیر مسلم احکام کفر (یعنی اپنے قانون) پر باقی رہیں گے۔

اس دوسری قسم کے مطابق جن غیر مسلموں سے معاہدہ کیا جائے گا، ان کی ریاست دار الاسلام نہ کہلائے گی، بلکہ دار الصلح یا دار العہد کہلائے گی۔

دار الامن:

اسلام میں شہریت کے تناظر میں دیکھ جائے، تو ریاست کے اعتبار سے ایک اور قسم "دار الامن" کی ہے۔ "دار الامن" دو لفظوں سے مرکب ہے، جس کا معنی امن کے گھر کے آتے ہیں۔ فقہاء نے اپنی کتابوں میں "امان" کی اصطلاح کو استعمال کیا ہے، اور اسی اصطلاح کے ذیل میں دار الامن کا تصور بھی وجود میں آتا ہے۔ غرضیکہ ان کے نزدیک امان کی دو قسمیں ہیں، وقتی امان اور ابدی امان۔ پھر وقتی امان کی دو قسمیں ہیں، امانِ معروف اور امانِ مشروط۔ امانِ معروف تو یہ ہے کہ جنگی ماحول میں مسلمان کسی علاقہ پر غالب آجائیں، اور غالب آنے کے بعد وہاں کے غیر مسلموں کو امان فراہم کر دیں۔ امان کی دوسری قسم یہ ہے کہ دار الاسلام یا کسی بھی مسلم ریاست میں داخلہ کے لئے ریاست ایک مخصوص مدت کے لئے کسی غیر مسلم کو وقتی امان یعنی اس کی جان مال عزت آبرو اور مذہب کا تحفظ فراہم کیا جائے۔ ([36])

---

[33] مقدسی، ابن قدامة، **المغنی** (مکتبة القاهرة 1966ء) ج8ص526، ماوردی، ابو الحسن علی بن محمد، **الاحکام السلطانیة** (القاهره دارالحدیث) ص138، البهوتی، منصور بن یونس، **کشاف القناع عن متن الإقناع**، ج3ص95

[34] مقدسی، ابن قدامة، **المغنی** ج8ص528، الشافعی، محمد بن ادریس، **الام** ج4ص182، شیربینی، محمد بن احمد الخطیب، **مغنی المحتاج الی معرفة معانی الفاظ المنهاج**، ج4ص254

[35] کاسانی، علاء الدین، **بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع** ج7ص108

[36] **المرجع السابق**

یوں وہ غیر مسلم وقتی طور پر ریاست کا شہری بن جاتا ہے،اور اسے اپنی جان،مال،عزت آبرو،اور مذہب وغیرہ میں آزادی کے وہ تمام حقوق حاصل ہو جاتے ہیں،جو ریاست میں بسنے والے مستقل غیر مسلم شہری یعنی ذمی کو حاصل ہوتے ہیں۔اگرچند الفاظ میں ذمی اور وقتی طور پر امان حاصل کرنے والے کو سمیٹا جائے،تو ریاست کا غیر مسلم مستقل شہری کو ابدی امان حاصل ہوتی ہے،اور مستامن کو وقتی امان حاصل ہوتی ہے۔یوں جس جگہ اس غیر مسلم کو ریاست امان فراہم کرے،وہ جگہ دارالامن کہلاتی ہے۔جس شخص کو امان حاصل ہو،اسے مستامن کہا جاتا ہے،جس کا تفصیلی ذکر آگے مستقل فصل کے تحت آتا ہے۔

دارالبغی:

گو کہ اس تقسیم کا مسلم وغیر مسلم شہریت کے ساتھ تعلق نہیں ہے،تاہم اس تقسیم کا تعلق ایک تو ریاست کے ساتھ ہے،دوسرا من وجہ شہریت کے ساتھ بھی ہے اس لئے اس کو ذکر کیا جاتا ہے۔

دارالبغی بھی دو الفاظ سے مرکب ہے۔ایک دار اور دوسرا بغی۔جیسا کہ پہلے گزرا کہ دار کے معنی گھر کے آتے ہیں۔دوسرا لفظ بغی ہے،،جو کہ بغاوت سے ہے۔بغی کے معنیٰ تعدی، ظلم،ناانصافی اور حد سے تجاوز کرنے کے آتے ہیں۔اصطلاحی اعتبار سے یہ لفظ فئہ باغیہ یعنی باغی گروہ کے زمرے میں استعمال ہوتا ہے۔قرآن مجید اور احادیث میں بھی بغاوت اور فئہ باغیہ کا لفظ استعمال ہوا ہے۔احادیث میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے لئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا تھا کہ:

وَيْحَ عَمَّارٍ تَقْتُلُهُ الفِئَةُ البَاغِيَةُ([37])

ترجمہ:عمار کی ناک گرد آلود ہو اس کو ایک باغی جماعت قتل کرے گی۔

چنانچہ باغی اس شخص کو کہا جاتا ہے،جو حاکمِ وقت کی اطاعت سے مالی واجب کی ادائیگی سے منکر ہوتے ہوئے منکر ہو جائے۔([38])اور دارالبغی اس علاقہ کو کہا جاتا ہے کہ جو دارالاسلام کا حصہ ہو،لیکن اس علاقہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت حاکمِ وقت کی اطاعت سے کسی امر کی تاویل کرتے ہوئے نکل جائے،اور اس مخصوص علاقہ میں وہ اپنی حکومت قائم کرتے ہوئے اپنا الگ سے حاکم مقرر کرلے،اور یوں ان کی نفری اور دفاعی قوت علیحدہ ہو جائے۔([39])دارالبغی کے مخصوص احکامات ہیں،جو فقہاء نے اپنے مقام پر بیان کئے ہوئے ہیں۔ان کے احکام کی تفصیلات ہمارے اس موضوع کا حصہ نہیں ہے۔اس لئے ان سے تعرض نہیں کیا جاتا۔

مذکورہ بالا تفصیل کا جائزہ لیا جائے تو مکمل اسلامی فقہ میں جدید قومی ریاستوں کے تصور پر مبنی شہریت کا تصور موجود نہیں،تاہم فقہاء نے مذہب کی بنیاد پر شہریوں اور ریاست کی تقسیم کا تصور پیش کیا ہے۔اس تقسیم کی اساس مسلمان اور غیر مسلم شہریوں کی دینی شناخت ہے،جس کے تحت اسلامی ریاست کی اقسام اور غیر مسلموں کے حقوق وفرائض کو متعین کیا گیا ہے۔

پہلی تقسیم میں دارالاسلام کا تصور آتا ہے۔دارالاسلام اس علاقے کو کہا جاتا ہے جہاں اسلامی احکام کا ظہور ہو اور مسلمانوں کو فیصلہ کن سیاسی قوت حاصل ہو۔احناف کے نزدیک دارالاسلام میں اسلامی شعائر جیسے نماز جمعہ،عیدین کا قیام اور دیگر احکام کا اجرا لازم ہے۔شوافع اور دیگر

---

[37] البخاری،محمد بن اسماعیل،الجامع الصحیح(دار طوق النجاۃ الطبعۃ الاولیٰ 1422ھ)رقم 2812

[38] افریقی،ابن منظور،لسان العرب(دار صادر،بیروت 1414ھ)مادۃ:بغا

[39] مقدسی،ابن قدامۃ،المغنی ج8ص107،ابن ھمام،کمال الدین،فتح القدیر(دارالفکر)ج4ص408

فقہاء نے بھی اس کی تعریف اسی بنیاد پر کی ہے کہ وہاں اسلامی احکام نافذ ہوں۔ غیر مسلم شہری دارالاسلام میں عقدِ ذمہ کے ذریعے رہتے ہیں، جنہیں اہلِ ذمہ یا ذمی کہا جاتا ہے۔ان پر جزیہ لازم ہوتا ہے اور ریاست ان کے جان ومال کا تحفظ کرتی ہے۔

دوسری تقسیم دارالحرب یا دارالکفر کی ہے۔دارالحرب یا دارالکفر ایسے علاقے کو کہا جاتا ہے جہاں احکامِ اسلام نافذ نہ ہوں اور مسلمانوں کو امان حاصل نہ ہو۔امام ابو حنیفہ کے نزدیک دارالکفر کی بنیاد مسلمانوں کے لیے امن نہ ہونا ہے، جبکہ امام ابو یوسف، امام محمد اور امام مالک کے نزدیک اس کی بنیاد احکامِ کفر کا ظہور ہے۔ متاخرین احناف نے اس تعریف میں مزید تین شرائط شامل کیں: احکامِ کفر کا ظہور، دارالحرب سے اتصال اور مسلمانوں یا ذمیوں کو امن کا نہ ہونا۔

تیسری تقسیم دارالعہد کی ہے۔دارالعہد اس علاقے کو کہا جاتا ہے جس کے ساتھ اسلامی ریاست نے صلح یا معاہدہ کیا ہو۔اس معاہدے کے نتیجے میں بعض اوقات غیر مسلموں کی سرزمین اسلامی ریاست کے تابع آجاتی ہے اور بعض اوقات وہ محض ترکِ قتال پر مبنی ہوتا ہے، جس میں غیر مسلم اپنی زمین، قانون اور مذہب میں آزاد ہوتے ہیں۔ احناف اس معاہدے کو اس وقت جائز سمجھتے ہیں جب مسلمان کمزور ہوں، جبکہ دیگر فقہاء اسے بطور اصول جائز مانتے ہیں۔

چوتھی تقسیم دارلامن کی ہے۔دارالامن کا تصور وقتی امان پر مبنی ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم فرد یا جماعت اسلامی ریاست سے وقتی امان حاصل کرے تو اس وقت وہ شخص یا جماعت مستامن کہلاتی ہے اور جس جگہ اسے امان دی جائے، وہ دارالامن کہلاتی ہے۔ مستامن کو دارالاسلام میں مقیم ذمی کے برابر حقوق حاصل ہوتے ہیں، مگر وقتی مدت تک۔

پانچویں تقسیم دارالبغی کی ہے۔اگرچہ دارالبغی کا تعلق مسلم وغیر مسلم تقسیم سے نہیں ہے، لیکن ریاستی نظم ونسق سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ دارالبغی اس علاقے کو کہا جاتا ہے جہاں مسلمان باغی گروہ، حاکمِ وقت کی اطاعت سے نکل کر اپنی الگ حکومت قائم کرلیں۔ یہ علاقہ شرعاً دارالاسلام ہی ہوتا ہے لیکن وہاں مخصوص احکامِ بغاوت نافذ ہوتے ہیں۔

اسلامی فقہ میں جو شہریت کا تصور ابھرتا ہے، وہ خالصتاً مذہب پر مبنی ہے۔ فقہاء نے شہریوں کی حیثیت کا تعین ان کے ایمان وعقیدہ کی بنیاد پر کیا ہے، جس سے دو بڑے طبقات سامنے آتے ہیں: مسلمان اور غیر مسلم۔ اس کی بنیاد پر فقہی نظام میں حقوق وفرائض کی تقسیم سامنے آئی ہے۔ مثلاً مسلمانوں کو دفاع، حکومت اور قضاء جیسے مناصب حاصل ہوتے ہیں، جبکہ غیر مسلموں کو مذہبی آزادی اور جان ومال کا تحفظ حاصل ہوتا ہے، مگر ان پر جزیہ لازم آتا ہے۔ جدید ریاستی نظام میں شہریت کا یہ مذہبی تعین ایک چیلنج ہے، کیونکہ آج کی قومی ریاستیں شہریوں کے درمیان مذہب کی بنیاد پر فرق نہیں کرتیں، بلکہ مساوات اور قانونی برابری کو بنیاد بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عصری مفکرین اس روایت کی از سرنو تعبیر کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔

دارالاسلام کی تعریف کا جائزہ لیا جائے، تو یہ تعریف فقہی روایت کا مرکزی ستون ہے۔اس کا بنیادی عنصر ''اسلامی احکام کا ظہور'' اور ''مسلمانوں کی فیصلہ کن قوت'' ہے۔احناف نے اس کی واضح علامتیں مقرر کی ہیں، مثلاً نماز جمعہ، عیدین، اور اسلامی عدالتوں کا قیام۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقہاء نے دارالاسلام کو صرف جغرافیائی نہیں بلکہ نظامی حیثیت دی۔ تاہم آج کے دور میں جب مسلمان اقلیتیں مغربی ریاستوں میں بھی دینی شعائر ادا کرسکتی ہیں، تو دارالاسلام کا تصور محدود ہو جاتا ہے۔ لہٰذا عصرِ حاضر کے مسلم معاشروں میں اس تصور کی تطبیق یا از سرنو وضاحت ناگزیر ہے۔

دوسری جانب دارالحرب اور دارالکفر کی تعریفیں محض عقیدہ کی بنیاد پر نہیں، بلکہ سیاسی و قانونی بالادستی پر بھی مبنی ہیں۔ امام ابو حنیفہ کا زور امن کی عدم موجودگی پر ہے، جب کہ دیگر ائمہ ''احکامِ کفر'' کے اجرا کو معیار قرار دیتے ہیں۔ متاخرین احناف کی جانب سے تین اضافی شرائط کی وضاحت اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ فقہی سوچ وقت کے ساتھ ساتھ حالات کے مطابق بدلتی رہی ہے۔ لیکن موجودہ دور میں، جب مسلم اور غیر مسلم ریاستوں کے درمیان باقاعدہ سفارتی تعلقات اور اقوام متحدہ جیسے عالمی فورمز موجود ہیں، اس تقسیم کی عملی حیثیت سوال طلب ہو گئی ہے۔ اب غیر مسلم ریاست کو دارالحرب قرار دینا نہ صرف ناقابلِ عمل ہے بلکہ غیر منطقی بھی محسوس ہوتا ہے۔ اب موجودہ ریاستیں قومی ریاستوں کی بناء پر ہیں، جن کے آپس میں معاہدات ہوتے رہتے ہیں۔ تاہم اگر کسی ریاست میں مسلمانوں کو ان کی جان مال اور مذہب کا امن حاصل نہ ہو، تو ان پر دارالحرب کا اطلاق کیا جاسکتا ہے۔

دارالعہد اور دارالامن جیسے تصورات اسلامی فقہ میں وسعت کو نمایاں کرتے ہیں۔ دارالعہد میں معاہدہ کرنے کی گنجائش، اور دارالامن میں وقتی امان کی صورت فقہاء نے ایسے قانونی دریچے فراہم کیے جن کے ذریعے غیر مسلم ریاستوں اور اقلیتوں کے ساتھ معاملات کو فہم و حکمت سے چلایا جاسکتا ہے۔ یہ تصورات آج کے معاہداتی بین الاقوامی قوانین (treaty-based international law) سے ہم آہنگ ہو سکتے ہیں، بشرطیکہ ان کی تعبیر نئی ریاستی ساخت اور جغرافیائی خود مختاری کے تناظر میں کی جائے۔

اگرچہ دارالبغی کا تعلق غیر مسلموں سے براہِ راست نہیں ہے، مگر اسے اس بحث میں شامل کرنا اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ فقہ اسلامی نے ریاستی نظم و نسق کی بحالی کو ہمیشہ اولیت دی۔ دارالبغی کی تعریف اور اس کے احکام ظاہر کرتے ہیں کہ اسلامی ریاست میں سیاسی وحدت اور اقتدار کی مرکزی حیثیت کو کتنا اہم سمجھا گیا۔ یہ نکتہ آج بھی مسلم دنیا کے سیاسی استحکام کے لیے نہایت اہم ہے، خاص طور پر ایسی ریاستوں میں جہاں داخلی مسلح گروہ ریاستی خود مختاری کو چیلنج کرتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ اسلامی فقہ نے شہری حیثیت، اقلیتوں کے حقوق اور ریاستی حدود کے حوالے سے ایک مکمل و مربوط فریم ورک تشکیل دیا تھا۔ تاہم اس فریم ورک کی تشکیل فقہی تعاریف کو دیکھتے ہوئے قرونِ وسطیٰ کے سیاسی، سماجی، اور عسکری حالات کے مطابق نظر آتی ہے۔ آج کے دور میں جب ریاستوں کی ساخت، عوامی شرکت، انسانی حقوق، اور عالمی قوانین یکسر بدل چکے ہیں، تو فقہی تعبیرات کی قرآن و سنت کے دائرہ کار میں رہتے ہوئے تجدید کی ضرورت ہے۔

غیر مسلم بطور مفتوح اور ذمی کا تصور

مسلم و غیر مسلم شہریت کی تقسیم سے مسلم و غیر مسلم بنیاد پر وجود میں آنے والے ریاست کے تصور کا ماقبل صفحات میں تفصیلا جائزہ لیا گیا ہے۔ درج بالا صفحات میں غیر مسلم شہریوں کے ریاست کے ساتھ تعلق کی بناء پر ریاست کی تقسیم کو بیان کیا گیا تھا۔ اب ریاست کے ساتھ تعلق کی بنیاد پر وجود میں آنے والی ان کی شہری حیثیت کا جائزہ لیا جائے گا۔ غیر مسلموں کی کل چار انواع سامنے آتی ہے۔ ذیل میں ان کا ذکر کیا جاتا ہے۔

غیر مسلم بطورِ مفتوح:

زمانہ قدیم میں جب جنگی نظام رائج تھا، تو اس وقت کسی بھی مفتوحہ علاقے میں بسنے والے باشندوں کو مفتوحین کہا جاتا تھا۔ ان مفتوحین کو اختیار دیا جاتا تھا کہ یا تو وہ مفتوحہ علاقہ جو کہ دارالاسلام بننے والا ہے، کے باقاعدہ غیر مسلم شہری بن جائیں، اور وہاں ابدی امان حاصل کر لیں، یا پھر اس علاقہ کو چھوڑ کر جانا چاہیں، تو جا سکتے ہیں۔ اسی طرح بسا اوقات ایسے مفتوحین اہل العہد یا اہل الصلح کے بھی زمرے میں آتے تھے، جب ان کے ساتھ صلح کا معاملہ ہو جائے۔ ایسے غیر مسلم کے احکام اسے زمرے میں آتے ہیں، جس کو وہ خود اختیار کرتا ہے، جیسا کہ اگر وہ ذمی ہونے کی حیثیت

کو اختیار کرتا ہے، تو اس اہل الذمہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگر وہ معاہد کی حیثیت اختیار کرتا ہے، تو اس پر موادع والے احکام اور اگر حربی کی حیثیت اختیار کرتا ہے، تو اہل الحرب والے احکام لاگو ہوں گے۔ غیر مسلموں کی ان سب الگ الگ شہری نوعیتوں اور حیثیتوں کو ذیل میں تفصیلا بیان کیا جاتا ہے۔

غیر مسلم بطورِ ذمی:

ذمی لفظ ''ذمہ'' سے نکلا ہے، جس کے معنی امان دینے اور عہد و معاہدہ کے آتے ہیں۔ اسی لفظ سے ذمیوں کے لئے ''اہل الذمہ'' کی اصطلاح بھی استعمال ہوتی ہے، جس کے معنی عہد و معاہدہ والوں کے آتے ہیں۔ فقہاء کی اصطلاح میں اہل الذمہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو مسلم حکمران کی جانب سے دار الاسلام میں ان کی جان، مال عزت آبرو کی جزیہ کے عوض حفاظت کی ضمانت دی جائے۔ مزید اس کے ساتھ غیر مسلم اسلامی ریاست کے قوانین کی پاسداری کا التزام بھی کریں۔([40])

دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے کہ جو غیر مسلم دار الاسلام میں ریاست کے ساتھ ایک خاص قسم کا عقد اور معاہدہ کریں، اور اس معاہدہ کی رو سے وہ اپنے مذہب پر برقرار رہتے ہوئے دار لاسلام کے ریاستی قوانین کا اپنے آپ کو پابند بنائیں، شرعی زبان میں ذمی و اہل الذمہ کہلاتے ہیں اور ان کا یہ معاہدہ ''عقدِ ذمہ'' کہلاتا ہے۔([41])

غیر مسلم ذمی کس طرح بن سکتا ہے؟

دار الاسلام میں کوئی بھی غیر مسلم ذمی کی حیثیت کس طرح اختیار کر سکتا ہے؟ کوئی بھی غیر مسلم دار الاسلام میں ذمی کی حیثیت مختلف راستوں اور جہات سے حاصل کر سکتا ہے، مثلا عقدِ ذمہ، ایسے قرائن جو غیر مسلم کی رضا پر دلالت کریں، غلبہ یا فتح کے ذریعے ذمہ کا درجہ حاصل کرنا وغیرہ شامل ہیں۔

ا۔ عقدِ ذمہ:

دار الاسلام کے ساتھ غیر مسلموں کا ریاست میں اپنے مذہب پر برقرار رہتے ہوئے جزیہ کے عوض امن اور تحفظ فراہم کرنے کے معاہدہ کو عقدِ ذمہ کہتے ہیں، اور اس ریاست کے ساتھ اس عقد کے معرض وجود میں آنے کے بعد کوئی بھی غیر مسلم دار الاسلام میں ذمی کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے، اس عقدِ ذمہ کے بعد اس کو وہی بعض خاص قسم کے حقوق حاصل ہوتے ہیں، اور اس پر بعض خاص ریاستی فرائض بھی عائد ہوتے ہیں۔ عقد ذمہ باقی عقود کی طرح ایجاب اور قبول یا اس کے قائم مقام دوسرے الفاظ کے ذریعے ہی منعقد ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر اس عقدِ ذمہ کو کسی ریاست کے ساتھ بذریعہ تحریر منعقد کیا جائے، تو تحریر وغیرہ کے ذریعہ بھی منعقد ہو جاتا ہے۔([42])

چنانچہ علامہ کاسانی فرماتے ہیں:

(وأما) الأمان المؤبد فهو المسمى بعقد الذمة..... (أما) النص فهو لفظ يدل عليه، وهو لفظ العهد والعقد على وجه مخصوص.([43])

---

[40] البهوتی، منصور بن یونس، **کشاف القناع عن متن الإقناع**، ج3ص116

[41] مجموعة من المولفين، **الموسوعة الفقهية الكويتية** ج7ص104 مادة: اهل الحرب

[42] کاسانی، علاء الدین، **بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع** ج7ص111، الشامی، ابن عابدین، **رد المحتار علی الدر المختار** (بیروت، دارالفکر، 1992) ج3ص275

[43] کاسانی، علاء الدین، **بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع** ج7ص112

ترجمہ: رہی بات ابدی مان کی تو اس کو عقدِ ذمہ سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور یہ مختلف طرح سے منعقد ہوتا ہے۔ ایک قسم ظاہری ہے، کہ جس میں فریقین کی جانب سے ایسے الفاظ کا ہونا ضروری ہے، جو عقدِ ذمہ پر دلالت کریں۔ اور وہ الفاظ عہد اور باہمی عقد کے ہوتے ہیں (جیسا کہ عام عقود میں ایجاب و قبول ہوتا ہے)

عقدِ ذمہ کا مسلمانوں کی طرف سے فریق:

عقدِ ذمہ مسلمانوں کی طرف سے کون منعقد کرے گا، یا مسلمانوں کی طرف سے اس عقد کا فریق کون ہو گا؟ تو اس بارے میں جمہور فقہاء یعنی مالکیہ، شافعیہ اور حنابلہ کا موقف یہ ہے کہ کسی غیر مسلم کے ساتھ عقدِ ذمہ دار الاسلام کا صرف حاکمِ وقت یا اس کا نائب ہی فریق ہو سکتا ہے، ان کے علاوہ مسلمانوں میں سے کسی کو اختیار نہیں کہ وہ کسی غیر مسلم کے ساتھ عقدِ ذمہ میں ریاست کی طرف سے فریق بن سکیں۔([44]) تاہم احناف کے نزدیک عقدِ ذمہ میں دار الاسلام کی طرف سے کوئی بھی ریاست کا مسلم شہری فریق بن سکتا ہے، کیونکہ عقدِ ذمہ ایک طرح سے فرض ہو جاتا ہے، جب اس کا مطالبہ کسی غیر مسلم کی طرف سے کیا جائے، اور اس میں حکمت و مصلحت بھی ہے، تاکہ اس کو عقدِ ذمہ حاصل ہو جائے، اور ریاست میں بنا کسی تاخیر کے اس کی جان مال، عزت آبرو محفوظ ہو جائے۔([45])

عقدِ ذمہ کون سے غیر مسلم کے ساتھ ہو سکتا ہے؟

فقہاء کا اس بارے میں اتفاق نظر آتا ہے کہ عقدِ ذمہ غیر مسلموں میں سے اہل کتاب اور اہلِ مجوس کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ تاہم اہل کتاب اور اہلِ مجوس کے علاوہ کسی غیر مسلم کے ساتھ عقدِ ذمہ کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس بارے میں فقہاء کی آراء مختلف ہیں۔ چنانچہ شافعیہ اور حنابلہ کے مشہور قول کے مطابق اہل کتاب اور اہل مجوس کے علاوہ کسی اور غیر مسلم سے عقدِ ذمہ کرنا درست نہیں، اور نہ ہی شرع میں یہ جائز ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں مشرکین کو تمام مشرکین کو قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔([46]) اور آیتِ جزیہ([47]) سے صرف اہل کتاب کو عقدِ ذمہ کا استثناء دیا گیا ہے۔ لہذا قرآن مجید کی رو سے صرف اہل کتاب اور مجوس اہل کتاب کے زمرے میں داخل ہوتے ہوئے ہی خاص ہوئے۔([48])

شافعیہ اور حنابلہ کے علاوہ احناف اور مالکیہ کی ایک روایت کے مطابق ہر قسم کے غیر مسلم کے ساتھ عقدِ ذمہ کرنا درست ہے، پھر چاہے وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والا ہی کیوں نہ ہو، سوائے عرب کے مشرکین کے۔([49]) اسی کے ساتھ مالکیہ کے مشہور قول کے مطابق ہر قسم کے غیر مسلم کے ساتھ عقدِ ذمہ کرنا درست ہے، پھر چاہے وہ عربی ہو یا عجمی ہو، عیسائی ہو یا یہودی ہو۔([50])

---

[44] شیربینی، محمد بن احمد، **مغنی المحتاج الی معرفة معانی الفاظ المنهاج**، ج4ص243، البهوتی، منصور بن یونس، **کشاف القناع عن متن الإقناع**(دار الکتب العلمیة) ج3ص116، مقدسی، ابن قدامة، المغنی ج8ص505

[45] ابن همام، کمال الدین، **فتح القدیر**(دارالفکر) ج5ص213

[46] **التوبة:5**

[47] **التوبة:29**

[48] مقدسی، ابن قدامة، **المغنی** ج8ص496، الشافعی، محمد بن ادریس، **الام** ج4ص240

[49] کاسانی، علاء الدین، **بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع** ج7ص112، مقدسی، ابن قدامة، **المغنی** ج8ص505

[50] **کشاف القناع عن متن الإقناع** ج3ص117

میرے نزدیک احناف کی رائے درست ہے، کیونکہ عقدِ ذمہ کا تعلق غیر مسلم کے ریاست کے ساتھ تعلق اور اس کی جان مال، عزت آبرو کو امان فراہم کرنا ہے، اور یہ اس طرح کی امان شرعی اعتبار سے کسی بھی مذہب سے تعلق رکھنے والے غیر مسلم کو حاصل ہو سکتی ہے۔

عقدِ ذمہ کی شرائط:

فقہاء نے عقدِ ذمہ کے ساتھ کچھ شرائط بھی بیان کی ہیں، جن میں سے بعض شرائط میں تو ان کا اتفاق ہے، اور بعض شرائط میں ان کے مابین اختلاف پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اس شرط میں فقہاء کا اتفاق ہے کہ عقدِ ذمہ ابدی اور ہمیشہ کے لئے ہوتا ہے، وہ خود سے ختم نہیں ہو سکتا ہے، جب تک کہ کسی ایک فریق کی جانب سے کوئی ایسی چیز نہ پائی جائے، جو عقد ذمہ کو ختم کرنے والی ہو۔ اسی طرح عقدِ ذمہ کے ساتھ مزید ایک شرط فقہاء نے یہ بھی بیان کی ہے کہ عقدِ ذمہ کے ساتھ یہ شرط رکھنا ضروری ہے کہ غیر مسلم عبادات کے علاوہ ریاست کے تمام قوانین کی پاسداری کے پابند ہوں گے۔ ریاست کے کسی قانون کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ اسی طرح ان موانعات سے بھی رکنے کا التزام کریں گے، جو ان کے مذہب اور مذہبِ اسلام میں قدرِ مشترک کے طور پر ہیں، جیسے چوری، زنا وغیرہ([51])

اس کے علاوہ بعض فقہاء نے کچھ شرائط ایسی بھی بیان کی ہیں، جو ان کی اپنی تقسیم ہے، جیسا کہ علی بن محمد ماوردی متوفی 450ھ نے بھی کچھ ایسی ہی تقسیم کی ہے۔ چنانچہ علامہ ماوردی نے عقدِ ذمہ کی شرائط کی تقسیم دو اعتبار سے کی ہے۔ ایک تو ان کے نزدیک واجب اور ضروری شرائط ہیں، کہ جن کا عقدِ ذمہ میں ہونا ضروری ہے، اور ان کے بنا عقدِ ذمہ کا انعقاد ہی نہیں ہوتا، اور ان شرائط کی خلاف ورزی کرنے پر غیر مسلم شہری کے ساتھ عقدِ ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔ ان شرائط کو علامہ ماوردی ''مستحق شرائط'' کی اصطلاح سے موسوم کرتے ہیں۔ اور دوسری قسم کی شرائط وہ ہیں کہ جن کی پاسداری اور تسلیم عقدِ جزیہ میں ضروری نہیں ہے، اور نہ ہی غیر مسلم شہری کی جانب سے خلاف کرنے پر عقدِ ذمہ ختم ہو جاتا ہے، بلکہ اگر تو ان شرائط کو عقدِ ذمہ کے ساتھ معاہدہ میں شامل کر لیا جائے، تو بہتر ہے، وگرنہ ان کے بنا بھی عقدِ ذمہ کا معاہدہ منعقد ہو جاتا ہے، تاہم اگر اس قسم کی شرائط کے معاہدہ میں شامل ہونے کے باوجود غیر مسلم شہری ان کی خلاف ورزی کرے، تو اس سے عقدِ ذمہ تو ختم نہیں ہوتا، تاہم ان کی خلاف ورزی کرنے پر غیر مسلم شہری کے ساتھ ریاست تادیبی کاروائی کر سکتی ہے۔ شرائط کی اس اختیاری قسم کو علامہ ماوردی ''مستحب شرائط'' کی اصطلاح سے موسوم کرتے ہیں۔([52])

چنانچہ ''مستحق شرائط'' کا ذکر کرتے ہوئے علامہ ماوردی فرماتے ہیں کہ یہ چھ ہیں۔

1۔ یہ کہ غیر مسلم شہری کتاب اللہ یعنی قرآن مجید میں کسی قسم کا طعن اور تحریف کا ذکر نہیں کریں گے۔

2۔ یہ کہ غیر مسلم شہری آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ تو جھوٹ باندھیں گے، اور نہ ہی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تنقیص کریں گے۔

3۔ یہ کہ دینِ اسلام کا ذکر کرتے ہوئے غیر مسلم شہری برے الفاظ استعمال نہیں کریں گے، اور نہ ہی اس پر کوئی جرح وقدح کریں گے۔

4۔ یہ کہ غیر مسلم شہری کسی مسلمان عورت کے ساتھ نہ تو زنا کا ارتکاب کریں گے، اور نہ ہی اس کے ساتھ نکاح کریں گے۔

---

[51] مقدسی، ابن قدامة، **المغنی** ج8ص507

[52] ماوردی، ابو الحسن علی بن محمد، **الاحکام السلطانیة** ص226

5۔یہ کہ کسی مسلمان شہری کو اس کے دینِ اسلام سے ورغلانے اور بہکانے کی کوشش نہیں کریں گے،اور نہ ہی اس کے جان ومال پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کریں گے۔

6۔یہ کہ غیر مسلم شہری اہل حرب کے ساتھ کسی قسم کی کوئی معاونت نہیں کریں گے،اور نہ ہی کو اسلامی ریاست کے خلاف کسی قسم کی جانی ومالی معاونت فراہم کریں گے۔([53])

مستحب شرائط کا ذکر کرتے ہوئے علامہ ماوردی فرماتے ہیں کہ یہ بھی چھ ہی ہیں۔

1۔غیر مسلم شہری اپنے لباس کو مسلمانوں کے لباس سے ممتاز سے رکھیں گے۔

2۔مسلمانوں کے مقابلے میں اپنی عمارتیں اونچی اور بلند و بالا قائم نہیں کریں گے۔

3۔اپنے مذہبی مقدسات اور آیات کی تلاوت کی آواز اتنی بلند نہ کریں گے کہ دوسروں کو سنائی دے۔

4۔اعلانیہ اور بر سر عام شراب نوشی نہ کریں گے،اور نہ ہی صلیب یا مذہبی شعائر کا اعلانیہ اظہار کریں گے۔

5۔اپنے لوگوں کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں کریں گے۔

6۔یہ کہ وہ قیمتی اور تیز رفتار گھوڑوں کو بطورِ سواری استعمال نہیں کریں گے،ہاں خچر اور گدھے کو بطورِ سواری استعمال کر سکتے ہیں۔

ان شرائط کے ذکر کرنے کے بعد علامہ ماوردی فرماتے ہیں کہ یہ شرائط مستحب ہیں،یہ شرائط عقدِ ذمہ کے ساتھ لازم نہیں ہوتیں،اور ان کے معاہدہ کے ساتھ لازم کرنے کے بعد ان کے پورا نہ کرنے کی وجہ سے عقدِ ذمہ بھی ختم نہیں ہوتا۔لیکن اگر ان کو معاہدہ میں شامل کر لیا گیا ہو،تو ان کا پورا کرنا غیر مسلم کی طرف سے لازم ہوگا،اور اگر ان کو پورا نہ کیا جائے،تو غیر مسلم شہری کو تادیبی کاروائی کرنے کا بھی ریاست کو حق ہوگا۔([54])

فقہاء نے ان شرائط کا استنباط حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غیر مسلموں کے ساتھ عقدِ ذمہ کے وقتِ معاہدہ کی شرائط سے کیا ہے۔چنانچہ ایک روایت السنن الکبریٰ میں مروی ہے،([55]) جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ حضرت عبدالرحمٰن بن غنم نے فرمایا کہ:

"كَتَبْتُ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ حِينَ صَالَحَ أَهْلَ الشَّامِ: بِسْمِ اللهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ , هَذَا كِتَابٌ لِعَبْدِ اللهِ عُمَرَ أَمِيرِ الْمُؤْمِنِينَ مِنْ نَصَارَى مَدِينَةِ كَذَا وَكَذَا , إِنَّكُمْ لَمَّا قَدِمْتُمْ عَلَيْنَا سَأَلْنَاكُمُ الْأَمَانَ لِأَنْفُسِنَا وَذَرَارِيِّنَا وَأَمْوَالِنَا وَأَهْلِ مِلَّتِنَا , وَشَرَطْنَا لَكُمْ عَلَى أَنْفُسِنَا أَنْ لَا نُحْدِثَ فِي مَدِينَتِنَا وَلَا فِيمَا حَوْلَهَا دَيْرًا وَلَا كَنِيسَةً وَلَا قَلَّايَةً وَلَا صَوْمَعَةَ رَاهِبٍ , وَلَا نُجَدِّدَ مَا خَرِبَ مِنْهَا , وَلَا نُحْيِيَ مَا كَانَ مِنْهَا فِي خُطَطِ الْمُسْلِمِينَ , وَأَنْ لَا نَمْنَعَ كَنَائِسَنَا أَنْ يَنْزِلَهَا أَحَدٌ مِنَ الْمُسْلِمِينَ فِي لَيْلٍ وَلَا نَهَارٍ , وَأَنْ نُوَسِّعَ أَبْوَابَهَا لِلْمَارَّةِ وَابْنِ السَّبِيلِ , وَأَنْ نُنْزِلَ مَنْ مَرَّ بِنَا مِنَ الْمُسْلِمِينَ ثَلَاثَةَ أَيَّامٍ وَنُطْعِمَهُمْ , وَأَنْ لَا نُؤْمِّنَ فِي كَنَائِسِنَا وَلَا مَنَازِلِنَا جَاسُوسًا , وَلَا نَكْتُمَ غِشًّا لِلْمُسْلِمِينَ , وَلَا نُعَلِّمَ أَوْلَادَنَا الْقُرْآنَ , وَلَا نُظْهِرَ شِرْكًا وَلَا نَدْعُوَ إِلَيْهِ أَحَدًا , وَلَا نَمْنَعَ أَحَدًا

---

[53] ماوردی،ابو الحسن علی بن محمد،**الاحکام السلطانیة** ص226

[54] ماوردی،ابو الحسن علی بن محمد،**الاحکام السلطانیة** ص226

[55] اس روایت کے راوی یہ ہیں: **أَخْبَرَنَا أَبُو طَاهِرٍ الْفَقِيهُ، أنبأ أَبُو الْحَسَنِ عَلِيُّ بْنُ مُحَمَّدِ بْنِ سَخْتَوَيْهِ , ثنا أَبُو بَكْرِ بْنُ يَعْقُوبَ بْنِ يُوسُفَ الْمُطَّوِّعِيُّ، ثنا الرَّبِيعُ بْنُ ثَعْلَبٍ، ثنا يَحْيَى بْنُ عُقْبَةَ بْنِ أَبِي الْعَيْزَارِ، عَنْ سُفْيَانَ الثَّوْرِيِّ، وَالْوَلِيدِ بْنِ نُوحٍ، وَالسَّرِيِّ بْنِ مُصَرِّفٍ، يَذْكُرُونَ عَنْ طَلْحَةَ بْنِ مُصَرِّفٍ، عَنْ مَسْرُوقٍ، عَنْ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ غَنْمٍ،**

مِنْ قَرَابَتِنَا الدُّخُولَ فِي الْإِسْلَامِ إِنْ أَرَادَهُ , وَأَنْ نُوَقِّرَ الْمُسْلِمِينَ , وَأَنْ نَقُومَ لَهُمْ مِنْ مَجَالِسِنَا إِنْ أَرَادُوا جُلُوسًا , وَلَا نَتَشَبَّهَ بِهِمْ فِي شَيْءٍ مِنْ لِبَاسِهِمْ مِنْ قَلَنْسُوَةٍ وَلَا عِمَامَةٍ وَلَا نَعْلَيْنِ وَلَا فَرْقِ شَعَرٍ , وَلَا نَتَكَلَّمَ بِكَلَامِهِمْ , وَلَا نَتَكَنَّى بِكُنَاهُمْ , وَلَا نَرْكَبَ السُّرُوجَ , وَلَا نَتَقَلَّدَ السُّيُوفَ , وَلَا نَتَّخِذَ شَيْئًا مِنَ السِّلَاحِ , وَلَا نَحْمِلَهُ مَعَنَا , وَلَا نَنْقُشَ خَوَاتِيمَنَا بِالْعَرَبِيَّةِ , وَلَا نَبِيعَ الْخُمُورَ , وَأَنْ نَجُزَّ مَقَادِيمَ رُءُوسِنَا , وَأَنْ نَلْزَمَ زِيَّنَا حَيْثُ مَا كُنَّا , وَأَنْ نَشُدَّ الزَّنَانِيرَ عَلَى أَوْسَاطِنَا , وَأَنْ لَا نُظْهِرَ صُلُبَنَا وَكُتُبَنَا فِي شَيْءٍ مِنْ طَرِيقِ الْمُسْلِمِينَ وَلَا أَسْوَاقِهِمْ , وَأَنْ لَا نُظْهِرَ الصَّلِيبَ عَلَى كَنَائِسِنَا , وَأَنْ لَا نَضْرِبَ بِنَاقُوسٍ فِي كَنَائِسِنَا بَيْنَ حَضْرَةِ الْمُسْلِمِينَ , وَأَنْ لَا نُخْرِجَ سَعَانِينَا وَلَا بَاعُونًا , وَلَا نَرْفَعَ أَصْوَاتَنَا مَعَ أَمْوَاتِنَا , وَلَا نُظْهِرَ النِّيرَانَ مَعَهُمْ فِي شَيْءٍ مِنْ طَرِيقِ الْمُسْلِمِينَ , وَلَا نُجَاوِرَهُمْ مَوْتَانَا , وَلَا نَتَّخِذَ مِنَ الرَّقِيقِ مَا جَرَى عَلَيْهِ سِهَامُ الْمُسْلِمِينَ , وَأَنْ نُرْشِدَ الْمُسْلِمِينَ , وَلَا نَطَّلِعَ عَلَيْهِمْ فِي مَنَازِلِهِمْ. فَلَمَّا أَتَيْتُ عُمَرَ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ بِالْكِتَابِ زَادَ فِيهِ: وَأَنْ لَا نَضْرِبَ أَحَدًا مِنَ الْمُسْلِمِينَ , شَرَطْنَا لَهُمْ ذَلِكَ عَلَى أَنْفُسِنَا وَأَهْلِ مِلَّتِنَا وَقَبِلْنَا مِنْهُمُ الْأَمَانَ , فَإِنْ نَحْنُ خَالَفْنَا شَيْئًا مِمَّا شَرَطْنَاهُ لَكُمْ فَضَمِنَّاهُ عَلَى أَنْفُسِنَا فَلَا ذِمَّةَ لَنَا , وَقَدْ حَلَّ لَكُمْ مَا يَحِلُّ لَكُمْ مِنْ أَهْلِ الْمُعَانَدَةِ وَالشَّقَاوَةِ''([56])

ترجمہ: میں نے حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے لیے اس وقت لکھا جب انہوں نے اہل شام سے صلح کی: بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ یہ تحریر اللہ کے بندے عمر امیر المومنین کی طرف سے فلاں فلاں شہر کے عیسائیوں کے لیے ہے۔ جب آپ ہمارے پاس آئے تو ہم نے اپنی جانوں، اپنی اولاد، اپنے مال اور اپنی قوم کے لیے آپ سے امان طلب کی۔ اور ہم نے آپ سے اپنے اوپر یہ شرائط عائد کیں کہ ہم اپنے شہر میں اور اس کے آس پاس کوئی نیا گرجہ، کلیسا، خانقاہ یا راہب کا صومعہ نہیں بنائیں گے۔ ہم ان میں سے کسی کی مرمت نہیں کریں گے جو خراب ہو چکا ہو۔ ہم ان میں سے کسی کو دوبارہ نہیں بنائیں گے جو مسلمانوں کی زمینوں میں واقع ہو۔ ہم اپنے گرجوں کو مسلمانوں کے لیے دن رات کھلا رکھیں گے تاکہ وہ ان میں ٹھہر سکیں۔ ہم ان کے دروازے مسافروں اور راہگیروں کے لیے کشادہ رکھیں گے۔ ہم مسلمانوں میں سے جو ہمارے پاس سے گزرے گا اس کی تین دن تک میزبانی کریں گے اور اسے کھانا کھلائیں گے۔ ہم اپنے گرجوں اور گھروں میں کسی جاسوس کو پناہ نہیں دیں گے۔ ہم مسلمانوں سے کوئی دھوکا نہیں کریں گے۔ ہم اپنی اولاد کو قرآن نہیں پڑھائیں گے۔ ہم شرک کو ظاہر نہیں کریں گے اور نہ ہی کسی کو اس کی دعوت دیں گے۔ ہم اپنے کسی رشتہ دار کو اسلام میں داخل ہونے سے نہیں روکیں گے اگر وہ اسلام قبول کرنا چاہے۔ ہم مسلمانوں کی عزت کریں گے۔ اگر وہ بیٹھنا چاہیں تو ہم اپنی مجالس سے ان کے لیے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ہم لباس میں ان سے مشابہت اختیار نہیں کریں گے، نہ ٹوپی میں، نہ عمامہ میں، نہ جوتوں میں اور نہ بالوں کے انداز میں۔ ہم ان کی زبان میں بات نہیں کریں گے۔ ہم ان کے ناموں سے اپنے آپ کو نہیں پکاریں گے۔ ہم زین پر سوار نہیں ہوں گے۔ ہم تلواریں نہیں لٹکائیں گے۔ ہم کوئی ہتھیار نہیں رکھیں گے اور نہ ہی اسے اپنے ساتھ لے کر چلیں گے۔ ہم اپنی انگوٹھیوں پر عربی میں نقش نہیں کروائیں گے۔ ہم شراب نہیں بیچیں گے۔ ہم اپنے سر کے اگلے حصے کے بال کٹوائیں گے۔ ہم ہر جگہ اپنے مخصوص لباس میں رہیں گے۔ ہم اپنی کمروں پر زنار باندھیں گے۔ ہم اپنی صلیبوں اور کتابوں کو مسلمانوں کے راستوں اور بازاروں میں ظاہر نہیں کریں گے۔ ہم اپنے گرجوں پر صلیب ظاہر نہیں کریں گے۔ ہم مسلمانوں کی موجودگی میں اپنے گرجوں میں گھنٹیاں نہیں بجائیں گے۔ ہم اپنے جلوس نہیں نکالیں گے۔ ہم اپنے مردوں کے ساتھ اپنی آوازیں بلند نہیں کریں گے۔ ہم مسلمانوں کے راستوں میں ان کے ساتھ آگ نہیں جلائیں گے۔ ہم اپنے مردوں کو ان سے آگے نہیں لے جائیں گے۔ ہم ایسے غلام نہیں بنائیں گے جن پر مسلمانوں کا حق ہو۔ ہم مسلمانوں کی رہنمائی کریں گے اور ان کے گھروں میں جھانک کر نہیں دیکھیں گے۔ جب میں یہ تحریر لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس آیا تو انہوں نے اس میں یہ اضافہ کیا کہ ہم کسی مسلمان کو نہیں ماریں

[56] بیهقي،علی بن موسیٰ،**السنن الکبریٰ**(بیروت دار الکتب العلمیة، لبنات،الطبعة الثالثة 2003ء)رقم الحدیث 18717

گے۔ ہم نے یہ شرائط اپنے اوپر اور اپنی قوم پر عائد کیں اور ان سے امان قبول کی۔ اگر ہم ان شرائط میں سے کسی کی خلاف ورزی کریں گے جو ہم نے آپ سے کی ہیں تو ہمارا کوئی عہد نہیں رہے گا اور آپ کے لیے وہ سب جائز ہو گا جو سرکشوں اور بدبختوں کے ساتھ جائز ہوتا ہے۔

گو کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مذکورہ معاہدہ سے بعض فقہاء نے عقدِ ذمہ کی مذکورہ بارہ شرائط پر استدلال پیش کیا ہے، تاہم ان میں سے اکثر شرائط ایسے ہیں، جو کسی بھی وقت کے سماج یا حالات کے تناظر سے تعلق رکھتی ہیں۔ ان سے کسی دینی یا شرعی مسئلہ کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی، کیونکہ نہ تو ان شرائط کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے، اور نہ ہی احادیث میں ان کا ذکر ملتا ہے۔

عقدِ ذمہ توڑنے والے عوامل:

بعض عوامل تو ایسے ہیں جن سے عقدِ ذمہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے، اور بعض ایسے ہیں جن سے عقدِ ذمہ ٹوٹ جاتا ہے۔ چنانچہ اگر کوئی غیر مسلم شہری اسلام قبول کرلے، تو ریاست کے ساتھ اس کا عقدِ ذمہ خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ اس عامل پر تمام فقہاء کا اتفاق ہے۔

1. اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم شہری دارالحرب میں جا بسے، اور دارالاسلام کو چھوڑ دے، تو اس کا بھی عقدِ ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔
2. فقہاء نے عقدِ ذمہ کو جزیہ کے ساتھ بھی خاص کیا ہے۔ لہذا احناف کے علاوہ باقی فقہاء کے نزدیک اگر کوئی غیر مسلم شہری جزیہ ادا کرنے سے منع کردے، تو اس کے ساتھ بھی عقدِ ذمہ ختم ہو جاتا ہے۔ تاہم اگر مالی استطاعت نہ ہونے کے باعث جزیہ ادا کرنے سے قاصر ہو جائے، تو ان کے نزدیک اس کا عقدِ ذمہ ختم نہیں ہوتا۔([57]) جمہور فقہاء کے علاوہ احناف نے گو کہ جزیہ کا عقدِ ذمہ کا ایک حصہ ضرور قرار دیا ہے۔ تاہم احناف کے نزدیک اگر کوئی غیر مسلم شہری جزیہ ادا کرنے سے منع کردے، تو اس کا عقدِ ذمہ نہیں ٹوٹتا، کیونکہ جزیہ ادا نہ کرنے کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ہاں اگر اس نے ریاست یا اس کے قوانین سے بغاوت کرتے ہوئے جزیہ ادا کرنے سے منع کیا، تب حنفیہ کے نزدیک بھی اس کا عقدِ ذمہ ٹوٹ جائے گا۔([58])
3. اس کے علاوہ عقدِ ذمہ کے توڑنے والے بعض دیگر عوامل بھی ہیں، جو گو کہ متفق علیہ تو نہیں ہیں، لیکن فقہاء نے انفرادی طور پر انہیں عقدِ ذمہ کے نواقض میں شمار کیا ہے۔ مالکیہ کے نزدیک عقدِ ذمہ دارالاسلام کے قوانین سے بغاوت کرنے، یا ان سے لاپرواہی برتنے کی عادت بنانے، اور مسلمان عورت سے جبراً زنا کا ارتکاب کرنے، یا اس سے نکاح کرنے، یا مسلمان عورتوں کی تانک جھانک کرنے، اور کسی نبی کی شان میں ایسی گستاخی کرنے جو ان کے عقیدہ کا حصہ نہ ہو، سے عقدِ ذمہ ٹوٹ جاتا ہے۔ تاہم اگر کوئی ذمی کسی نبی کی شان میں ایسی گستاخی کرے، جو مسلم عقیدہ کے لحاظ سے تو گستاخی ہو لیکن ان کے مذہبی عقیدہ ہو، تو اس سے عقدِ ذمہ نہیں ٹوٹے گا، مثلاً کسی عیسائی کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا وغیرہ کہنا۔([59])
4. شافعیہ کے نزدیک اگر کوئی غیر مسلم شہری کسی مسلمان عورت کے ساتھ زنا کر بیٹھے، یا اس کے ساتھ نکاح کرلے، یا کسی مسلم شہری کو دینِ اسلام سے ورغلانے اور بہکانے کی کوشش کرے، یا قرآن اور اسلام پر طعن و تشنیع کرے، یا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر برے

---

[57] مرغینانی، برهان الدین ابو الحسن، **الهداية فی شرح بداية المبتدی**، بیروت، دار احیاء التراث العربی، ج5ص303، شیربینی، محمد بن احمد، **مغنی المحتاج الی معرفة معانی الفاظ المنهاج** ج4ص258

[58] ابن همام، کمال الدین، **فتح القدیر** ج5ص303

[59] ازهری، صالح عبد السمیع، **جواهر الإكليل شرح مختصر الخليل**(، بیروت المكتبة الثقافية) ج1ص269

الفاظ کے ساتھ کرے، تو اگر تو عقدِ ذمہ میں اس نے ان سب کاموں کے نہ کرنے کی شرط کو تسلیم کیا ہو، تو ان کے نزدیک سے عقدِ ذمہ ٹوٹ جائے گا، وگرنہ نہیں ٹوٹے گا۔([60])

5. حنابلہ کی مشہور روایت کے مطابق اگر کوئی غیر مسلم شہری مذکورہ ممانعات کا اطلاق کر بیٹھتا ہے، تو اس کا عقدِ ذمہ ٹوٹ جائے گا، گو کہ اس نے ان کاموں کے نہ کرنے کا عقدِ ذمہ میں معاہدہ کیا ہو، یا نہ کیا ہو۔([61])
6. حنفیہ نے اس بات کی صراحت کی ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم شہری یعنی ذمی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کر بیٹھے، لیکن اس نے یہ گستاخی اعلانیہ نہ کی ہو تو اس کے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے سے اس کا عقدِ ذمہ نہیں ٹوٹے گا۔ تاہم اگر اس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی اعلانیہ کی ہو، تو اگرچہ وہ عورت ہی کیوں نہ ہو، اس کو سزا اور عبرت کے طور پر ریاست کی طرف سے قتل کی سزا دی جائے گی۔ اسی طرح حنفیہ کے نزدیک اگر کوئی ذمی کسی مسلمان عورت سے نکاح کرلے، یا کسی مسلم شہری کو قتل کردے، تو ان کے ارتکاب کرنے سے اس کا عقد ذمہ نہیں ٹوٹے گا۔

چنانچہ علی بن ابو بکر مرغینانی متوفی 593ھ فرماتے ہیں:

" ومن امتنع من الجزية أو قتل مسلما أو سب النبي أو زنى بمسلمة لم ينتقض عهده) لأن الغاية التي ينتهي بها القتال التزام الجزية لا أداؤها والالتزام باق. وقال الشافعي: سب النبي يكون نقضا"([62])

ترجمہ: جس غیر مسلم شہری نے جزیہ دینے سے منع کیا، یا کسی مسلمان کو قتل کیا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کی، یا کسی مسلمان عورت سے زنا کیا تو اس سے اس کا عقدِ ذمہ نہیں ٹوٹے گا۔ کیونکہ غیر مسلم کو قتل کرنے سے منع ہونے کی ایک انتہائی وجہ جزیہ کا التزام کرلینا ہے، نہ کہ ادا کرنا، اور التزام اس صورت میں باقی ہے، امام شافعی فرماتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنا عقدِ ذمہ کو توڑ دیتا ہے۔

شافعیہ، حنابلہ، مالکیہ اور حنفیہ کے عقدِ ذمہ کے نواقض کا بغور مطالعہ کیا جائے، تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ بعض نواقض تو ایسے ہیں، جن کا تعلق معاہدہ کے ساتھ ہے، یعنی اگر وہ باتیں معاہدہ میں طے کرلی جائیں، پھر غیر مسلم شہری کی طرف سے ان کا ارتکاب پایا جائے، تو ظاہر ہے کہ یہ معاہدہ کی خلاف ورزی کے زمرے میں آتا ہے، یہ نہ صرف نواقض میں سے ہوتا ہے، بلکہ ریاست اگر چاہے تو اس پر کاروائی بھی کرسکتی ہے۔

تاہم نواقض کی دوسری قسم کا تعلق بذاتِ خود معاہدہ کے ساتھ ہی ہے، یعنی عقدِ ذمہ کے ساتھ خود بخود وہ اشیاء معاہدہ میں شامل تصور کی جاتی ہیں، جیسے اسلام کی تنقیص نہ کرنا، قرآن کی بے حرمتی نہ کرنا وغیرہ، کیونکہ یہ چیزیں دارالاسلام کی ریاست کے ریاستی بقاء کا حصہ ہیں، جو کہ ریاست کا من وجہ قانون ہیں۔ اور ان کا ارتکاب کرنے والا ریاست کے قانون سے باغی تصور کیا جائے گا۔ باقی مختلف فیہ نواقض جیسے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی، مسلمان کو قتل کرنا، مسلمان عورت سے نکاح کرنا وغیرہ کے بارے میں حنفیہ کا قول زیادہ مضبوط معلوم ہوتا ہے کہ ان

---

[60] شیربینی، محمد بن احمد، **مغنی المحتاج الی معرفة معانی الفاظ المنهاج** ج4ص261

[61] **کشاف القناع عن متن الإقناع** ج3ص143، مقدسی، ابن قدامة، **المغنی** ج8ص525

[62] مرغینانی، علی بن ابی بکر، **الهدایة فی شرح بدایة المبتدی** ج2ص404

سے عقدِ ذمہ فاسد نہیں ہوتا، کیونکہ ان کا تعلق دارالاسلام ریاست کے قوانین سے اس وقت ہوگا، جب ریاستی سطح پر کسی ایک فقیہ کے قول کے مطابق وہاں کا قانون بن جائے، جیسا کہ پاکستان میں متعدد قوانین فقہ حنفی سے مطابقت نہیں رکھتے، تاہم ریاست کے قانون کے طور پر تصور کئے جاتے ہیں، اوران قوانین کی پاسداری نہ کرنے والا مسلم یا غیر مسلم کوئی بھی شہری ریاست کا باغی سمجھا جاتا ہے۔

عقدِ ذمہ توڑنے والے ذمی کی حیثیت:

اگر کوئی غیر مسلم شہری یعنی ذمی فقہاء کے مذکورہ اختلاف کے مطابق عقدِ ذمہ کے نواقض میں سے کسی ایک کا ارتکاب بیٹھتا ہے، تو فقہاء نے اس کے بارے میں تفصیل بیان کی ہے کہ ریاست کے نزدیک وہ کس قسم کا مجرم شمار کیا جائے گا، اور ریاست اس کو کس قسم کی سزا دے گی، اور اس پر کس قسم کے احکام کا اطلاق ہوگا؟

فقہائے حنفیہ نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم شہری یعنی ذمی عقدِ ذمہ توڑ دے، تو ریاست سے باغی تصور کرتے ہوئے، اس کا حکم مرتد والا ہوگا، اور اس پر ارتداد والے احکام لاگو ہوں گے۔ اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم شہری دارالاسلام کو چھوڑ کر دارالحرب میں جابسا، اور دارالاسلام میں اس نے اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ دیا، تو دارالاسلام کے قانون کے مطابق وہ مرا ہوا تصور کیا جائے گا۔ یہاں موجود جائیداد و ترکہ اس کے بیوی بچوں میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ تاہم اگر وہ دارالاسلام میں واپس آجاتا ہے، اور ریاست سے معافی مانگتا ہے، تو اس کا عقدِ ذمہ واپس تصور کیا جائے گا، اور ریاست اسے معاف کر کے اپنی سرزمین پر رہنے کی اجازت فراہم کر دے گی۔ ([63])

مالکیہ اور شافعیہ نے بھی عقدِ ذمہ کے اسبابِ نواقض کے حسبِ اختلاف عقد توڑنے والے ذمی کی حیثیت اور اس کی سزا کو بیان کیا ہے۔ مالکیہ کے نزدیک ایسے ذمی جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے، یا کسی مسلمان عورت سے جبراً زنا کرے، یا اس کو اس کے اسلام سے ورغلا کر اس سے شادی کر لے، تو ایسے ذمی کو ریاست قتلِ سزا دے گی، اور وہ ذمی جو مسلمان عورتوں کی تانک جھانک کرتا ہو، اور انہیں بے پردہ دیکھنے کی کوشش کرتا ہو، تو حاکمِ وقت کو اس کے سزا کے بارے میں اختیار ہو گیا کہ اگر تو وہ مناسب سمجھے تو اسے قتلِ سزا دے سکتا ہے یا اسے غلام کا درجہ دے سکتا ہے۔ بالکل ایسے ہی اگر کوئی ذمی دارالحرب چلا جائے، پھر اسے جنگ کے نتیجے میں قیدی بنالیں، تو اس کو غلام حاکم غلام بنا سکتا ہے۔ ([64])

شافعیہ کے نزدیک کو اسی وقت قتلِ سزا دے جائے گی، جب وہ اعلانِ جنگ یا اعلانیہ لڑائی کرتے ہوئے ریاست سے عقدِ ذمہ توڑے، بصورتِ دیگر اس کو قتلِ سزا نہیں دی جائے گی، بلکہ حاکم وقت کو اختیار ہوگا کہ تعزیراً جو مناسب سمجھے اسے سزا دے سکتا ہے، جس میں حسبِ حالات، قتلِ سزا، غلام بنانا، جیل میں ڈالنا یا پھر جلاوطن کرنا شامل ہے۔ ([65])

حنابلہ نے اسبابِ نقض کے مابین کوئی فرق کر کے عقد توڑنے والے ذمی کی حیثیت یا اس کی سزا کو بیان نہیں کیا، بلکہ ان کے نزدیک حاکمِ وقت کو چار سزاؤں کا اختیار ہے، جو مناسب سزا سمجھے وہ عقدِ ذمہ توڑنے والے غیر مسلم شہری کو دے سکتا ہے، جن میں قتلِ سزا، غلام بنانا، جلاوطن

---

[63] الشامی، ابن عابدین، **رد المحتار علی الدر المختار** (بیروت دارالفکر، 1992) ج3ص277

[64] ازھری، صالح عبد السمیع، **جواھر الإکلیل شرح مختصر الخلیل** ج1ص269

[65] ماوردی، علی بن محمد، **الحاوی الکبیر** (بیروت، دار الکتب العلمیة، ،الطبعة الاولیٰ 1999ء) ج14ص173

کرنا،اور قیدی بنانا شامل ہیں۔([66])تاہم ان سب کے باوجود تمام فقہاءاس بات پر متفق نظر آتے ہیں کہ مذکورہ سزائیں صرف عقد توڑنے والے ذمی کے ساتھ خاص رہیں گی، یہ سزائیں اس کے اہل وعیال یا اس کے متعلقین کو نہیں دی جائیں گی، بلکہ اس کے متعلقین اور اہل وعیال کا عقدِ ذمہ باقی رہے گا۔([67])

مذکورہ تمام فقہاء نے عقد توڑنے والے ذمی کی سزاؤں کا ذکر تو کیا ہے، تاہم میرے نزدیک عقد توڑنے والے ذمی کی حیثیت اور سزا کا تعلق اس بات سے ہے کہ اس کا عقد توڑنا کس نوعیت اور کس سنجیدگی کا حامل ہے۔ اگر تو اس کے عقد توڑنے کی وجہ سے ریاست میں فتنہ فساد پیدا ہونے کا اندیشہ ہو، تو حاکمِ وقت اس فتنے کو روکنے کے لئے اسے سخت سے سخت سزا بھی دے سکتا ہے، تاکہ دوسروں کے لئے اس میں عبرت کا سامان بھی ہو، اور ریاست میں امن بھی برقرار رہے۔ تاہم اگر تو اس کا عقد توڑنا متعدی نقصانات کا حامل نہیں ہے، تو ریاست اس پر جسمانی سزا کے بجائے مالی سزا بھی عائد کر سکتی ہے، جیسا کہ بعض فقہاء "تعزیر بالمال" کے جواز کے قائل ہیں۔ اور انہی کے قول کے مطابق دورِ حاضر میں متعدد ریاستوں میں ریاست کے متعدد قوانین کی خلاف ورزی کرنے پر بھاری مالی جرمانے رکھے گئے ہیں۔

۲۔ قرائن کے ذریعہ ذمی بن جانا:

کوئی بھی غیر مسلم دار الاسلام کا شہری یا ذمی ایک تو عقدِ ذمہ سے بن سکتا ہے، جس کا ذکر تفصیل سے گزشتہ اوراق میں گزر چکا۔ دوسری قسم قرائن کے ذریعہ ذمی بن جانا ہے۔ یعنی کسی غیر مسلم نے ریاست کے ساتھ باقاعدہ عقدِ ذمہ تو نہیں کیا، لیکن ایسے قرائن سامنے آئے، کہ جن کی بنیاد پر اسے ذمی کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ پھر یہ قرائن بھی دو طرح کے ہیں۔ جن کو ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔ دار الاسلام میں قیام کرنا:

کسی غیر مسلم کو ذمہ دار الاسلام میں ایک خاص مدت تک قیام کرنے سے بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ تاہم اگر غیر مسلم ایک مخصوص مدت تک کے لئے دار الاسلام میں قیام کرے، تو اس کو فقہاء ذمہ نہیں کہتے، بلکہ اس کو امانِ موقت سے تعبیر کرتے ہیں، جس کو مستامن بھی کہا جاتا ہے۔ جمہور فقہاء یعنی حنفیہ، شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک اگر کوئی مستامن ایک سال کی مدت سے کم قیام کرتا ہے، تو اس کو ذمہ حاصل نہیں ہوتا، لیکن اگر اس کا قیام ایک سال یا ایک سال سے زیادہ ہو جائے، تو اس کو مذکورہ فقہاء کے نزدیک ذمہ حاصل ہو جاتا ہے، اور وہ غیر مسلم ریاست کا غیر مسلم شہری یعنی ذمی تصور کیا جاتا ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ہی اس پر خود بخود جزیہ لازم ہو جاتا ہے۔([68])

احناف نے اس سلسلہ میں قدرے تفصیل بیان کی ہے۔ چنانچہ اگر کوئی حربی دار الاسلام میں وقتی امان لے کر داخل ہو تو حاکمِ وقت اس کو جتنی مدت مناسب سمجھے تو اس مخصوص مدت تک کے لئے قیام کی اجازت دے سکتا ہے، تاہم اس کے ساتھ حاکمِ وقت اس کو اس بات کا بھی پابند بنا سکتا ہے کہ امان دیتے ہوئے اس غیر مسلم کو یہ کہے کہ مقررہ مدت گزرنے کے بعد آپ ذمی ہو جاؤ گے، تو مخصوص مدت گزرنے کے بعد وہ غیر مسلم خود بخود ذمی ہو جائے گا۔ پھر اگر وہ مقررہ پوری نہ ہو، تو بعض حنفیہ کا یہ کہنا ہے کہ ایک سال گزرنے کے بعد وہ غیر مسلم ذمی ہو جائے گا، لیکن بعض دیگر حنفیہ کا یہ کہنا ہے کہ اگر مقررہ مدت پوری ہو جائے، تو حاکمِ وقت اسے ریاست سے نکلنے کا حکم دے گا، پھر بھی وہ غیر مسلم ریاست میں

---

[66] مقدسی،ابن قدامة،**المغنی** ج9ص254

[67] الشامی،ابن عابدین،**رد المحتار علی الدر المختار** ج3ص278، ازهری،صالح عبد السمیع، **جواهر الإکلیل شرح مختصر الخلیل** ج1ص270

[68] کاسانی،علاء الدین،**بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع** ج7ص110، ماوردی،ابو الحسن علی بن محمد،**الاحکام السلطانیة** ص146

حاکمِ وقت کے نکلنے کے حکم دینے کے بعد ایک سال تک قیام رکھے، تو تب وہ ذمی کی حیثیت اختیار کرے گا۔ لیکن اگر حاکمِ وقت اسے مقررہ مدت کے گزرنے کے بعد ریاست سے نکلنے کا حکم نہ دے، تو پھر چاہے دو سال ہی کیوں نہ گزر جائیں، وہ غیر مسلم ذمی نہیں ہو گا۔([69])

ب۔ذمی یا مسلمان کا حربی عورت سے نکاح کرنا:

قرائن کی دوسری قسم یہ ہے کہ دارالاسلام میں پہلے سے بسنے والا ذمی یا مسلمان کسی مستامنہ حربی اہل کتاب عورت سے نکاح کرلے، تو اس عورت کو خود بخود ذمہ حاصل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ فقہاء کے نزدیک بیوی رہائش اور مسکن میں شوہر کے تابع ہوتی ہے، اور اس کا یہ تابع ہونا جبرا نہیں ہوتا، بلکہ اس عورت کی رضامندی سے ہوتا ہے۔ کیونکہ عمومی طور پر جہاں شوہر رہائش اختیار رکھتا ہے، بیوی بھی طبعًا اسی مقام پر رہائش رکھنا پسند کرتی ہے، ہاں بسا اوقات کوئی مانع پایا جاتا ہے، لیکن حکم اکثریت کے اعتبار سے ہے۔ قرائن کا اس طرح سے ذمہ صرف غیر مسلم عورت کو حاصل ہوتا ہے۔ اگر کوئی غیر مسلم مستامن دارالاسلام کی کسی ذمی عورت سے نکاح کرلے، تو اس کو اس طرح قرائن کے ذریعہ ذمہ حاصل نہیں ہوتا، کیونکہ ذمی عورت شوہر کے تابع ہو گی، اور شوہر کو بذاتِ خود ذمہ حاصل نہیں ہے۔([70])

حنابلہ کا اس سلسلہ میں موقف حنفیہ سے بالکل مختلف ہے۔ ان کے نزدیک اگر کوئی مستامن عورت کسی ذمی سے نکاح کرلے، تو اس کو اس طرح ذمہ تو حاصل ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ واپس دارالحرب میں جانا چاہے، اور شوہر بھی راضی ہو، تو ریاست اس عورت کو دارالاسلام میں رکنے پر مجبور نہیں کر سکتی، جبکہ حنفیہ کے نزدیک ریاست اس عورت کو دارالاسلام میں رکنے پر مجبور کرے گی۔

چنانچہ ابن قدامہ مقدسی المتوفی 620ھ فرماتے ہیں:

"وإذا دخلت الحربية إلينا بأمان، فتزوجت ذميا في دارنا، ثم أرادت الرجوع، لم تمنع، إذا رضي زوجها أو فارقها. وقال أبو حنيفة، تمنع."([71])

ترجمہ: جب کوئی حربی عورت ہمارے پاس امان لے کر آئے، پھر کسی ذمی مرد دارالاسلام میں نکاح کرلے، پھر واپس جانا چاہے، تو اگر اس کا شوہر راضی ہو، یا اس کو چھوڑ دے، تو ریاست اس عورت کو نہیں روکے گی۔ امام ابو حنیفہ نے فرمایا کہ ریاست اس کو روکے گی۔ میرے نزدیک حنابلہ کا موقف زیادہ مضبوط ہے۔ کیونکہ نکاح ایک ضرورت ہے، جو کہ مستامنہ عورت اپنی فطری ضرورت کی وجہ سے کسی ذمی سے کر سکتی ہے۔ اور جب اس کا دارالاسلام میں وقت پورا ہو جائے، تو وہ اپنے علاقہ میں جا سکتی ہے۔ اسے ریاست دارالاسلام میں جبری طور پر نہیں روک سکتی۔

3۔تبعًا ذمی بن جانا:

بعض ایسی بھی صورتیں ہیں، جن میں فقہاء نے بعض افراد کو کسی ایک چیز کے تابع بناتے ہوئے ذمی قرار دیا ہے۔ ان میں دو صورتیں خاص طور پر فقہاء کی کتب میں مذکور ہیں، جن کا ذیل میں ذکر کیا جاتا ہے۔

ا۔بیوی اور نابالغ بچے:

---

[69] کاسانی، علاء الدین، **بدائع الصنائع فی ترتیب الشرائع** ج7ص111

[70] سرخسی، محمد بن احمد، **المبسوط**(بیروت دارالمعرفة، 1414ھ)ج10ص84

[71] مقدسی، ابن قدامة، **المغنی** ج9ص246

جمہور فقہاء یعنی حنفیہ شافعیہ اور حنابلہ نے اپنی کتب میں اس بات کی صراحت کی ہے کہ نابالغ بچے اپنے باپ، ماں یاماں باپ دونوں کے تابع ہوتے ہوئے، ذمہ حاصل کر لیتے ہیں، جب ان کے ماں باپ کو ریاست کی طرف سے ذمہ دے دیا جائے۔([72])ہاں جب اہل الذمہ کے بچے بالغ ہو جائیں، تو بنا کسی عقدِ جدید کے ان سے جزیہ لیا جائے گا، کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کی بات مروی نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل الذمہ کے بچوں کے بالغ ہونے کے بعد سے ان کے عقدِ جدید کیا ہو۔([73])البتہ شافعیہ کے اصح قول کے مطابق اہل الذمہ کے بچوں کے بالغ ہونے کے بعد ان سے عقدِ جدید کیا جائے گا، تاکہ ان کی رضامندی سے ان کے ساتھ ذمہ کا معاہدہ کیا جاسکے، جس کے بعد وہ ریاست کو اپنی رضامندی سے کئے گئے عقد کی بنیاد پر جزیہ ادا کر سکیں۔([74])

ب۔راستہ سے اٹھایا ہوا نومولود بچہ:

فقہاء کے مابین اس سلسلہ میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ اہل الذمہ کے کسی مقام جیسے ان کے رہائشی علاقے، ان کے کنیسہ یا عبادت خانے میں کوئی نومولود لاوارث بچہ پایا گیا، اگرچہ اسے کوئی مسلمان ہی وہاں رکھ کر چلا گیا ہو، تو حنفیہ کی ظاہر الروایہ کے مطابق اور مالکیہ کے مشہور قول کے مطابق وہ بچہ اہل الذمہ کے تابع ہو کر ذمی ہی شمار کیا جائے گا، نہ کہ مسلمان۔([75])جبکہ شافعیہ اور حنابلہ کے نزدیک اگر دار الاسلام میں، جس میں اہل الذمہ بھی ہوں، یا ایسا علاقہ جسے مسلمانوں نے فتح کیا ہو، اور وہاں کے غیر مسلموں کے ساتھ صلح کر کے ان کو ان کے علاقے میں برقرار رکھا ہو، تو اس طرح کے علاقوں راستہ میں کوئی لاوارث بچہ چھوڑ گیا، ہو تو وہ بچہ مسلمان ہی شمار ہوگا، نہ کہ ذمی۔ اگرچہ وہ بچہ اہل الذمہ کے علاقے سے ہی کیوں نہ ملا ہو۔ کیونکہ اغلب یہی ہے کہ وہ بچہ کسی مسلمان کا ہوگا، اس لئے کہ اس ریاست کی اکثریتی آبادی مسلمان ہے۔([76])

میرے نزدیک اس سلسلہ میں سب سے معقول قول حنفیہ کا ہی ایک اور قول ہے، جس کے مطابق اس سلسلہ میں واجد کا اعتبار ہوگا، کہ اس بچے کو اٹھانے والا اور پانے والا شخص کون ہے۔ اگر اس کو اٹھانے والا اور پانے والا شخص مسلمان ہے، تو وہ مسلمان تصور کیا جائے گا، اور اگر اس کو اٹھانے والا شخص کوئی ذمی ہے، تو وہ بچہ ذمی ہی تصور کیا جائے گا۔ یہ بات ملحوظ رہے کہ پانے والے اور اٹھانے والے سے مراد اس کا پتہ دینے والے کا نہیں، بلکہ اس بچے کو گود لینے اور پالنے والا ہے۔

چنانچہ علامہ مرغینانی فرماتے ہیں:

"اہل الذمہ کے علاقے میں سے کسی علاقے میں یا ان کے عبادت خانے یا گرجا میں کوئی لقیط یعنی نومولود لاوارث بچہ ملا، تو وہ ذمی ہوگا۔ یہ جواب اس وقت ہے کہ جب واجد ذمی ہو، اور اگر اسی مقام پر واجد مسلمان ہو، یا پھر مسلمانوں کے علاقے میں واجد ذمی ہو، تو اس بارے میں روایت مختلف ملتی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق اس مکان کا اعتبار ہوگا، بعض نسخوں میں کتاب الدعوی میں ہے کہ واجد کا اعتبار ہوگا، یہ روایت ابن سماعہ کی امام محمد سے ہے۔ کیا آپ دیکھتے نہیں کہ تبعیتِ والدین تبعیتِ دار پر فوقیت رکھتی ہے۔"([77])

---

[72] مقدسی، ابن قدامة، **المغنی** ج9ص247

[73] شیرازی، ابراهیم بن علی، **المهذب**(بیروت، دار الکتب العلمیة) ج2ص253، سرخسی، محمد بن احمد، **المبسوط** ج10ص18

[74] نووی، یحییٰ بن شرف، **روضة الطالبین**(بیروت لمکتب الإسلامي، الطبعة الثالثة، 1991ء) ج8ص300

[75] الشامی، ابن عابدین، **رد المحتار علی الدر المختار** ج3ص326، ازهری، صالح عبد السمیع، **جواهر الإکلیل شرح مختصر الخلیل** ج2ص220

[76] مقدسی، ابن قدامة، **المغنی** ج5ص748

[77] مرغینانی، برهان الدین ابو الحسن، **الهدایة فی شرح بدایة المبتدی**، ج2ص416

4۔غلبہ اور فتح کے ذریعہ ذمہ کا حصول:

ذمہ کی یہ قسم بھی عقد کے زمرے میں ہی آتی ہے، تاہم اس قسم میں ریاست انفرادی طور پر ہر ایک غیر مسلم سے عقدِ ذمہ نہیں کرتی، بلکہ مسلمان اسلامی علاقے کے علاوہ دیگر کسی علاقے کو فتح کریں، اور وہاں کے غیر مسلموں کو غلام بنانے کے بجائے، انہیں آزاد چھوڑ دیں، اور حاکم انہیں آزاد چھوڑ کر ان تمام علاقے والوں پر مجموعی طور پر جزیہ مقرر کر دے۔ خلفائے راشدین کے دور میں اس کی مثالیں بکثرت ملتی ہیں۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دورِ حکومت میں ولید بن عقبہ رضی اللہ عنہ نے آذربائیجان کی طرف رخ کیا، اور اس علاقہ کو اسلامی ریاست کا حصہ بنایا۔

1. اور وہاں کے غیر مسلموں سے سالانہ آٹھ لاکھ درہم کا جزیہ طے قرار پایا۔([78])
2. قبرص کے علاقے کے غیر مسلموں سے آٹھ ہزار دینار بطورِ جزیہ کے مصالحت ہوئی۔([79])
3. نیساپور کے علاقے والوں سے بیس لاکھ بطورِ جزیہ کے عوض صلح ہوئی۔([80])
4. اہل بلخ سے چار لاکھ درہم بطورِ جزیہ کے صلح ہوئی۔([81])

خلاصہ یہ ہے کہ غیر مسلم اسلامی ریاست کا عقدِ ذمہ کے ذریعے شہری بن سکتا ہے۔ تاہم یہ بات قابلِ تحقیق ہے کہ پاکستان کے غیر مسلم شہری کس نوعیت کے اسلامی ریاست کے شہری ہیں۔ اس میں دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک پہلو اور زاویہ نگاہ یہ ہے کہ پاکستان کی تاریخ کو دیکھا جائے، تو آزادی پاکستان کے وقت ہی بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح نے غیر مسلموں کو ریاست میں پناہ دی، اور ریاست میں ان کے حقوق کی ذمہ داری اٹھائی۔ یہ ایک قسم کا عقدِ ذمہ ہی تھا جس کی رو سے اس وقت کے غیر مسلم، موجودہ اور آنے والی غیر مسلموں کی نسلیں ذمی کی حیثیت رکھتی ہیں۔

دوسرا زاویہ نگاہ یہ ہے کہ جب پاکستان آزاد ہوا، تو اس وقت کی غیر مسلم اقلیتوں کے بڑے نمائندوں نے قائد اعظم کے ساتھ معاہدہ کیا تھا، کہ پاکستان کی آزادی کے بعد ہمیں حقوق ملیں گے، اور ہم مساوی شہریت کے حامل ہوں گے۔ اس کی رو سے پاکستان کی آزادی مسلم اور اس علاقہ میں پائے جانے والے غیر مسلموں کے مابین مشترک ہوئی۔ اس کی رو سے پاکستان میں غیر مسلموں کی شہری حیثیت ذمی کی نہیں، بلکہ معاہد کی ہوئی۔ بہر حال یہ موضوع مستقل تحقیق کا موضوع ہے، جس پر تحقیق ہونی چاہیے۔

مذکورہ بالا صفحات کا جائزہ لیا جائے تو اسلامی فقہ میں غیر مسلم شہریوں کو ان کی ریاستی حیثیت کے مطابق دو بنیادی اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے، مفتوح اور ذمی۔ اس تقسیم کی بنیاد فقہاء نے جنگی پس منظر، سیاسی اختیار، اور معاہداتی حیثیت پر رکھی ہے۔ یہ تقسیم نہ صرف قانونی بلکہ تہذیبی و تمدنی سطح پر بھی اثرانداز ہوتی رہی ہے۔ مفتوح اور ذمی کا فرق دراصل یہ بتاتا ہے کہ اسلامی فقہ صرف مذہبی شناخت پر ہی نہیں، بلکہ عملی صورت حال اور معاہداتی تعلقات پر بھی بنیاد رکھتی ہے۔

غیر مسلم بطورِ مفتوح کا تصور کلاسیکی فقہ میں توسع کو اجاگر کرتا ہے۔ اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ مفتوحین کی حیثیت کوئی جامد یا مطلق سزا یافتہ حیثیت نہیں، بلکہ ان کی حیثیت مسلمانوں کے ساتھ کیے گئے معاہدے پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ معاہدہ ان کے لیے اجتماعی تحفظ، مذہبی

---

[78] قطب بن ابراهيم، **السياسة المالية لعثمان بن عفان** (الهيئة المصرية العامة للكتاب 1986)ص103

[79] المرجع السابق

[80] المرجع السابق

[81] المرجع السابق

آزادی، اور محدود شہری حقوق کی بنیاد بن سکتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی فقہ میں غیر مسلموں کے ساتھ سخت گیری کا نہیں بلکہ تعامل اور مفاہمت کا اصول موجود ہے، بشرطیکہ وہ ریاستی وفاداری کے دائرے میں رہیں۔ یہی اصول عصرِ حاضر کے آئینی معاہدات اور اقلیتوں کے قانونی تحفظ سے قریب تر دکھائی دیتا ہے۔

عقدِ ذمہ اسلامی سیاسی و قانونی تاریخ کا ایک منفرد معاہداتی تصور ہے جو غیر مسلم شہریوں کو ان کی مذہبی شناخت برقرار رکھتے ہوئے ریاستی نظام کا باقاعدہ شہری بناتا ہے۔ ذمی کو جان، مال، مذہب، عزت اور عقائد کا تحفظ دینا فقہی عدل و انصاف کی علامت ہے۔ جزیہ کے بدلے میں فراہم کردہ ریاستی ضمانت اس تصور کو ٹیکس نہیں بلکہ باہمی اعتماد کے معاہدے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ عصرِ حاضر میں اقلیتوں کے قانونی حقوق کی بحث میں عقدِ ذمہ ایک ایسا پیش رو ماڈل بن سکتا ہے جس میں مذہبی شناخت کے ساتھ ریاستی وفاداری کو مربوط کیا گیا ہے۔ تاہم عقدِ ذمہ غیر مسلم کو دوسرے درجے کے شہری کے طور پر اسلامی ریاست کا شہری بناتا ہے۔

فقہاء نے عقدِ ذمہ کے انعقاد کے مختلف ذرائع بیان کیے ہیں۔ براہِ راست معاہدہ، قرائن، تبعیت، اور اجتماعی معاہدہ۔ ان تمام صورتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ فقہاء نے شہری حیثیت کے تعین میں اپنے وقت کے اعتبار سے غیر معمولی وسعت، گہرائی اور حالات کا لحاظ رکھا ہے۔

عقدِ ذمہ کے تحت غیر مسلم شہریوں پر عائد کی جانے والی شرائط کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے، واجب اور مستحب۔ واجب شرائط کا تعلق ریاستی سالمیت، مذہب کی حرمت، اور سماجی امن سے ہے۔ جبکہ مستحب شرائط جیسے لباس کی تمایز یا عبادات کا عدمِ اظہار، دورِ وسطیٰ کی سماجی حساسیتوں کا آئینہ دار ہیں۔ عصرِ حاضر میں مستحب شرائط پر تنقید کی جاسکتی ہے کہ یہ غیر مسلم شہری کو دوسرے درجے کی حیثیت پر رکھتی ہیں، مگر فقہی اصول میں ان کی ''لازمی نہ ہونے'' کی صفت اس تصور کو نرم بناتی ہے۔ ان شرائط کی جدید تعبیر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ اقلیتیں آزادی سے رہیں، مگر ریاستی نظم و نسق کو چیلنج نہ کریں گے۔

ایک اہم پہلو عقدِ ذمہ کے ٹوٹنے کے اسباب میں پائے جانے والا فقہی اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک جزیہ کی عدم ادائیگی بذاتِ خود ناقض نہیں، جب تک کہ اس میں بغاوت کا عنصر شامل نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احناف نے سیاسی نظم کی بنیادی اکائی کو تسلیم کیا ہے اور صرف مالی خلاف ورزی پر معاہدے کو ختم نہیں کیا۔ اس کے برخلاف شوافع اور حنابلہ کا سخت مؤقف معاشرتی نظم کو مقدم رکھنے کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہاں اجتہادی تنوع واضح ہوتا ہے جو عصرِ حاضر کی قانونی تبدیلیوں کو قبول کرنے کی گنجائش دیتا ہے۔

عقدِ ذمہ کے ٹوٹنے پر سزا کا تصور ہر فقہی مکتبِ فکر میں مختلف ہے۔ احناف کا مؤقف نسبتاً نرم ہے، جبکہ شوافع اور مالکیہ کی آراء زیادہ سخت ہیں۔ تاہم تمام فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ سزا صرف اسی شخص کو ملے گی جس سے معاہدہ ٹوٹا ہو، اس کے خاندان یا اولاد پر اس کا اطلاق نہیں ہوگا۔

فقہاء کی اس پوری بحث کے تجزیے سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی فقہ نے غیر مسلموں کی حیثیت کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ مفتوحین اور ذمیوں کی قانونی، سیاسی اور سماجی حیثیت کو نہ صرف مذہب بلکہ معاہداتی اصولوں سے بھی جوڑا گیا ہے۔ یہ فقہی ڈھانچہ اپنی اصل میں ایسا قانون پیش کرتا ہے جس میں عقیدہ، وفاداری اور سماجی نظم کو یکجا کیا گیا ہے۔ عصرِ حاضر کے قانونی نظام میں، جہاں مذہبی آزادی، اقلیتوں کے حقوق، اور شہریت کا جدید تصور غالب ہے، اسلامی فقہ کے یہ اصول ایک ''اجتہادی فریم ورک'' کے طور پر نئی تعبیرات کے ساتھ رہنمائی فراہم کر سکتے ہیں۔

نتائج:

1. فقہاء نے مسلم و غیر مسلم ہونے کے اعتبار سے ریاست کا تصور پیش کیا ہے، جس میں دارالاسلام، دارالحرب، دارالامن، اور دارالعہد جیسی اصطلاحات کا تصور سامنے آتا ہے۔
2. فقہاء کے نزدیک دارالاسلام خالصتا مسلم شناخت کی بنیاد پر وجود میں آنے والی ریاست ہے۔ جس میں مسلمانوں کو فیصلہ کن قوت کا حاصل ہونا ضروری ہے۔
3. فقہاء کے اقوال کے مطابق دارالحرب سے مراد دارالاسلام کے ماسوا تمام غیر مسلم علاقے شامل ہیں، الا یہ کہ کسی غیر مسلم اہل علاقہ سے معاہدہ ہو جائے، اس بنیاد پر دارالحرب دارالعہد میں تبدیل ہو جاتا ہے۔
4. مذکورہ ریاستی اصطلاحات کے بعد شہریوں کا تصور وجود میں آتا ہے۔ دارالاسلام میں رہنے والے مسلمان مسلم شہری کہلاتے ہیں۔
5. دارالاسلام میں وقتی طور پر امن حاصل کر کے مقیم شہری مستامن کہلاتے ہیں، اور مستقل امن اور رہائش کے طلبگار غیر مسلم شہریوں کو ابدی شہریت حاصل کرنے کے لئے ریاست کے ساتھ عقدِ ذمہ کرنا ضروری ہے۔ جس کے بعد وہ ذمی کہلائیں گے۔
6. عقدِ ذمہ حاصل کے بعد وہ اسلامی ریاست کے شہری تو کہلائیں گے، تاہم عقدِ ذمہ کی شرائط کے مطابق وہ اسلامی ریاست کے دوسرے درجے کے شہری تصور کئے جائیں گے۔
7. عقدِ ذمہ غیر مسلم شہریوں کو مذہبی آزادی اور جان و مال کے تحفظ کے ساتھ ریاستی نظم میں شامل کرتا ہے، اگرچہ انہیں مکمل مساوی شہری حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔

سفارشات:

1. اسلامی فقہ میں شہریت کے مذہبی تصور کی قرآن و سنت کی روشنی میں ایسی تعبیر کی جائے جو جدید قومی ریاست کے مساواتی اور قانونی برابری کے اصولوں سے ہم آہنگ ہو سکے۔
2. دارالاسلام، دارالحرب اور دارالکفر جیسے تصورات کی نئی فقہی توضیح کی جائے تاکہ انہیں موجودہ بین الاقوامی نظام، سفارتی تعلقات اور ریاستی خود مختاری کے تناظر میں قابل عمل بنایا جا سکے۔
3. فقہی مکاتب کے اجتہادی اختلافات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک ایسا مشترکہ فقہی ماڈل تشکیل دیا جائے جو عصرِ حاضر کی ریاستی ضروریات اور اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کر سکے۔
4. فقہی مکاتب کے درمیان عقدِ ذمہ کے فسخ اور سزا کے احکام میں اختلاف اجتہادی وسعت کو ظاہر کرتا ہے، جو عصرِ حاضر میں قانونی تطبیق کی گنجائش فراہم کرتا ہے۔ اس گنجائش کے مطابق عصر حاضر میں غیر مسلموں کی اسلامی تعلیمات میں نہ صرف شہریت کے تصور کو واضح کیا جائے، بلکہ اس بنیاد پر ان کو حاصل ہونے والے حقوق و فرائض کا بھی تطبیقی جائزہ لیا جائے۔